پہلی بارش
ناصر کاظمی

پہلی بارش

ترتیب

نمبر شمار		صفحہ نمبر
(i)	عرضِ سُخن (دیباچہ طبع اوّل) ______ غالب احمد	۴
(ii)	دیباچہ طبعِ سوم ________ باصر سُلطان کاظمی	۸

غزلیں

۱۔	میں نے جب لکھنا سیکھا تھا	۲۸
۲۔	تُو جب میرے گھر آیا تھا	۲۹
۳۔	میں جب تیرے گھر پہنچا تھا	۳۰
۴۔	شام کا شیشہ کانپ رہا تھا	۳۲
۵۔	دِن کا پھول ابھی جاگا تھا	۳۳
۶۔	پتّھر کا شہر وہ بھی کیا تھا	۳۵
۷۔	پچھلے پہر کا سنّاٹا تھا	۳۶
۸۔	گرد نے خیمہ تھام لیا تھا	۳۸
۹۔	مجھ کو اور کہیں جانا تھا	۳۹
۱۰۔	تُو جب دوبارہ آیا تھا	۴۰
۱۱۔	تُجھ بِن گھر کتنا سونا تھا	۴۲
۱۲۔	دھوپ تھی اور بادل چھایا تھا	۴۴
۱۳۔	دم ہونٹوں پر آ کے رُکا تھا	۴۵
۱۴۔	چاند ابھی تھک کر سویا تھا	۴۷
۱۵۔	نئے دیس کا رنگ نیا تھا	۴۸
۱۶۔	چھوٹی رات، سفر لمبا تھا	۴۹

۱۷۔	تھوڑی دیر کو جی بہلا تھا	۵۱
۱۸۔	مَیں ترے شہر سے پھر گزرا تھا	۵۳
۱۹۔	میں اس شہر میں کیوں آیا تھا	۵۴
۲۰۔	پَل پَل کانٹا سا چُبتا تھا	۵۵
۲۱۔	روتے روتے کون ہنسا تھا	۵۷
۲۲۔	پَون ہری، جنگل بھی ہرا تھا	۵۸
۲۳۔	تنہائی کا دُکھ گہرا تھا	۵۹
۲۴۔	تیرا قصور نہیں، میرا تھا	۶۰

عرضِ سُخن

(دیباچہ طبعِ اوّل)

اردو زبان ایک استعارہ ہے جسے ہر دور کے ادیبوں کو از سرِ نو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ زبان، اپنے ماحول کے وجود اور وجدان کے ملاپ سے منقۂ شہود پر آتی ہے۔ جب تک وجود اور وجدان دونوں کی دہلیز پر کوئی، موجود، نہ ہو، زبان، یا کلام ممکن نہیں غیر موجودگی وجود میں وجدگی کیفیت پیدا نہیں کرسکتی۔ وجودیت کی قید میں مبتلا کرسکتی ہے جب کوئی، موجود، نہ ہو، ہم اپنے وجود کی اذّیت تو محسوس کرسکتے ہیں لیکن زندگی کی رواں دواں حرکت ممکن ، اس وقت خون اچھلنا بند کردیتا ہے۔ سورج کے آنے اور جانے کی گرمی اور شفق رنگی نہیں رہتی۔

اس خطۂ زمین میں انسانی زندگی نے پچھلی تین صدیوں میں اپنے جسم اور روح کے وصال کے لیے اردو زبان کو وجود دیا۔ اپنے ماضی، حال اور مستقبل اس وجود سے منسلک کیے، روایات تجربہ اور کشف اس میں شامل کیے اور اسے اپنی آرزوئے حیات کا ایک وسیلہ بنایا۔ اس خطۂ زمین کی انسانی زندگی اس اعتماد سے اُبھری کہ وہ حواس کی جنّت سے نکل کر آفاق کی وسعتوں کی طرف روانہ ہوگی لیکن حال کی دہلیز پر ہم وجودیت کی قید میں جکڑے گئے اور حقیقت سے دُور جا پڑے۔

حقیقت کے سوا اور کون موجود ہے؟ حُسن، اظہارِ حقیقت کا وجود ہے اور عشق اظہارِ حقیقت کا وجدان دونوں کا وصال زمان ومکاں کے ہر ذرّے میں موجزن ہے اور تمام انفس وآفاق کی حدود میں حرکت اور زندگی کا موجب ہے "میں" اور "تُو" اِسی رشتے کے دو پیکر ہیں۔ دو ایسے سائے، جو وصال وفراق کی دھوپ چھاؤں میں گھٹتے بڑھتے، ملتے ملاتے اور پَھلتے پُھولتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا لباس ہیں، ایک دوسرے کو اوڑھ کر ایک دوسرے کے لبادوں میں ملبوس وحال، کے لمحے کی دہلیز سے گزر کر اپنے مستقبل کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے ماضی کی وادیوں میں اترتے جاتے ہیں۔ حل کا لمحہ تو شعور کی ایک ایسی جھلک ہے، جس میں حقیقت اپنی چھب دکھلا کر ہمیں مستقبل کی آرزو میں ماضی کے قدیم خزینوں کی طرف لے جاتی ہے اور شعور کی ایسی منفرد اور ٹھری ہوئی ساکت جھلکیوں کا ایک سلسلہ لمحوں میں کچھ ایسا پر دیا ہوا ہمارے سامنے ہوتا ہے کہ ہم گزر رہے ہوتے ہیں اور حرکت ہمیں ان لمحوں میں پردئی ہوئی کڑی میں نظر آتی ہے۔ یہ لمحے، شعور کی اس جھلک پر لفظوں کے موتی ایجاد کرتے ہیں اور یہ لفظوں کے موتی ہم کو ماضی خزینوں کی طرف لے جاتے ہیں اور اس طرح ہماری زندگی کا یہ سفر، ہر لمحہ، ہر لحظہ جاری رہتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل شعور کے مختلف علاقے ہیں، جہاں مختلف زمانوں، زمینوں اور زبانوں میں انسانی زندگی کے سفر کی داستان کئی فصلوں کی صورت میں بار بار بوئی جاتی ہے اور بار بار کاٹی جاتی ہے۔

ایک عرصے تک کچھ اسی طرح، اس خطّۂ زمین پر، جسے سرزمین پاک وہنداب کہا جاتا ہے انسانی شعور نے من وتو کے وصال سے

لفظوں کے نئے موتی ایجاد کیے۔ فہم وادراک کے نئے اور پرانے خزینے دریافت کیےاور انسانی زندگی کی جیتی جاگتی آوازاور انسانی فہم و ادراک کی بولتی ہوئی زبانِ "اُردو"اس خِطّہ کے افق پر نمودار ہوئی۔

شاعری جذبےاور تخیّل سے جنم لیتی ہے۔ جذبات اور تخیّلات کے لیے ماحول کی چاردیواری کا ہونا لازمی ہے۔اس لیے کسی معاشرتی ماحول کی چاردیواری کے بغیر کسی زبان کی شاعری کا پرورش پانا ممکن نہیں۔ ماحول کے رنگ وبُو سے آزادرہ کر کوئی جذبہ یا تخیّل دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ جذبے کی قوّت وتوانائی اور تخیّل کی خوبصورتی اور دلکشی کا انحصار معاشرتی ماحول کی پائیداری اور اس ماحول کے مخصوص حالات کی سازگاری ہے۔

اردوزبان کی جس معاشرتی ماحول میں پرورش ہوئی ہے،اس کی پچھلے دوسوبرس کی تاریخ ہمیں یہ بات مان لینے پر مجبور کرتی ہے کہ ہماری اجتماعی روایات اور اختیارات میں اس قدر تیزی کے ساتھ پے در پے تبدیلیاں آتی چلی گئیں ہیں کہ ماحول معاشرتی اعتبار سے بہت حدتک ناپائیدار، بےاصل اور غیر یقینی نظر آتا رہاہےاور بار بار ہمارے جذبات اور تخیّل کے روایتی اور تاریخی رشتے ٹوٹ ٹوٹ کر بنتے بگڑتے رہے ہیں۔ افراتفری کا یہ تمام عہد خصوصاً غدر کے بعد کا زمانہ اور تقسیم پاک وہند کا دور اور شاعری کے لیے آزمائش اور ابتلا کی سنگین ترین گھڑیاں تھیں۔ ہمارے جذبات اور تخیّل کے وصال کے لیے نہ تو ماحول کی پرانی حویلی رہی اور نہ نیا گھر ہی بنا۔ پرانی حویلی کے نقوش بھی باقی ہیں اور نئے گھر کا اُدھورا سا نقشہ بھی سامنے ہے۔اس حال میں شاعر کو اپنی ذات کے علاوہ درحقیقت کسی اور چیز کی حقیقی ہونے پر بھروسہ نہیں رہا۔اس لیے جذبات اور تخیّل پر داخلی رجحانات کا غلبہ ایک لازمی امر تھا۔ ہمارے جذبات کا اظہار بھی داخلی تھا اور ہمارے تخیّل کی پرواز بھی داخلی تھی۔

اردو شاعری کے "عشقِ" اور "حُسن" کا قِصّہ دونوں دروں بینی کے آئینہ دار رہے۔اس کے طفیل عشق دماغ کا خلل قرار دیا گیا اور حُسن کو نظر کا دھوکہ سمجھا یا گیا، یعنی نہ ہمیں اپنے جذبات حقیقی نظر آئے اور نہ ہی ہمیں اپنے تخیّل میں اُچھلتی کودتی رواں دواں زندگی کی حرارت محسوس ہوئی اور اس طرح آہستہ آہستہ شاعر اور اس کی شاعری زندگی کے بہتے ہوئے دھارے سے دور ہوتے گئے جس شاعر نے شاعری کی مخصوص روایت پر اکتفا کی، وہ "حُسن وعشق" کا داستان گو یا "ادب برائے ادب" کا بیمار ٹھہرا اور جس نے زندگی کے قریب آنے کی جرأت کی وہ فلسفی یا ولی اللہ قرار دیا یا سیاستداں اور زمانہ ساز لیکن اس تمام دور میں اِن دونوں قسم کے شاعروں کے جذبات اور تخیّل کا رجحان داخلی زیادہ اور خارجی کم تھا۔

یہاں کسی حدتک کچھ تفصیل کے ساتھ انسانی زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جذبات ہمارے اندر کی دنیا کو خواہش اور طلب کے زور پر باہر کی دنیا سے آشنا کرتے ہیں اور تخیل باہر کی دنیا کو ہمارے حواس کے رستوں سے ہماری باطنی دنیا سے ملاتا ہے باطن کی دنیا اور ظاہر کی دنیا مل جُل کر ہماری زندگی میں عقل اور روح کی وحدت کو قائم رکھتے ہیں اور اس وحدت کو قائم رکھنے کے لیے ایک ایسے معاشیاتی ماحول کا ہونا ناگزیر ہے جس میں انسانوں کا ایک ملّی یا سماجی گروہ اپنی باطنی دنیا اور ظاہری دنیا کا وصال پاسکے۔ جذبات جہاں عشق اور محبت کے روپ میں اپنے ازلی اور ابدی ساتھی کے آغوش میں حُسن اور سچائی سے ہم کنار ہوسکیں، جہاں باطن اور ظاہر

دونوں میں قربت کا احساس پیدا ہوسکے۔

کسی حد تک جدید اردو شاعر کا اور بہت حد تک جدید تر اردو شاعر کا حال آسٹرین ناولسٹ کافکا ایسا ہے۔اس نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا:"میں اپنی ذات کے علاوہ باقی تمام اشیاء سے ایک خلا کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے منقطع ہوگیا ہوں۔اب مجھے ہر چیز نظر کا دھوکا دکھائی دیتا ہے۔کنبہ، دفتر، گلی کُوچے، عورت، سب دھوکے ہیں، جو کبھی کبھی پاس آتے ہیں اور پھر دُور ہوجاتے ہیں۔پس سچائی ہے یہ کہ میں اپنے سر کو ایک ایسی دیوار سے پھوڑ رہا ہوں جس میں نہ کوئی دروازہ ہے، نہ کھڑکی"______ یہ دیوار جدید اردو شاعر کے اپنے وجود کی دیوار ہے۔جس سے وہ پچھلے کئی سالوں سے اپنا سر پھوڑ رہا ہے اور اس دیوار میں نہ کوئی در ہے نہ کوئی روزن، اور اگر ہیں بھی تو وہ بند کردیئے گئے ہیں تاکہ جذبے اور تخیل کی اس فطری آرزو کا گلا گھونٹا جاسکے کہ وہ ہر دم کسی ماحول میں بسنے اور رچنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں۔جدید شاعر کے لیے جذبے اور تخیل کا یہ عمل اس کی اپنی ذات کے لیے غیر ضروری ہے کسی معاشرتی ماحول سے کسی وابستگی کے بغیر اسے یہ خواہش کیونکر ہو کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل کو ان کے تمام لوازمات کے ساتھ اپنے وجود میں اپنے وجدان میں زندہ رکھ سکے اور عشق اور حسن کے وصال کے رشتوں کو جذبے اور تخیل کے مناسب امتزاج سے قائم کرسکے اور زندگی کی پُرانی قدروں کو نئی اقدار سے آن ملائے اور زندہ رہنے کی خواہش کو مرنے نہ دے بلکہ اسے نئی آس اور نئی پیاس سے ہم آہنگ کرے اور نئی دنیا کے متلاشیوں کے لیے امید کا پیغام اپنی شاعری کی ہری بھری شاخ سے لاکردے۔۔

حُسن کی رعنائی اور سچائی کی توانائی محسوس کرنے کے لیے شاعر کو اپنی ذات کی انائیت اور انفرادیت سے بہت حد تک دستبردار ہونا پڑتا ہے اور قلب صافی کو پہلو میں لیے کسی معاشرے کے ماضی، حال اور مستقبل کی وادیوں میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔حقیقی شاعر معاشرے سے کبھی ناامید اور بزدل نہیں ہوتا، اُمید کا دامن نہیں چھوڑتا۔وہ معاشرے کی ذلتوں کو برداشت کرتا ہے۔حال کے طمانچوں کو بہتا ہے لیکن اس کی آنکھ حُسن اور سچائی کے تمام مناظر کو ماضی، حال اور مستقبل کے پس منظر میں دیکھنے اور سمونے کی قوّت رکھتی ہے اور وہ اپنے باطن سے تمام حسین اور سچّے جذبوں کو باہر کی حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے اور شاعری کا نغمہ ہمیشہ اس دوہری حقیقت کے مضراب سے پُھوٹتا ہے اور اس دوہری حقیقت کا مضراب شاعر کا دل ہوتا ہے۔اس عبوری دور میں اردو شاعری دل کی اس ماہیت سے محروم رہی ہے۔

تنہا شعور اور کورا کاغذ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں کورے کاغذ کی کُلفت کی داستان بہت بہت طویل ہے۔شعور کی زمین جب پانی کو ترسی ہے۔اور اس کی اپنی کوکھ سے پانی کے تمام خزانے خشکی کی نذر ہوجاتے ہیں تو شعور کورے کاغذ کی سطح پر ماہئی بے آب کی طرح تڑپتا ہے خشک مٹی کی بوباس اور اس کے تمام رنگ اور زنگ ایک زہر کی طرح اس کے ریشے ریشے میں سرایت کرنے لگتے ہیں۔لاشعور کی بھیانک گزری ہوئی راتیں، بیاباں دن اور ان کی تمام صعوبتیں اس کے چشمۂ حیات کی پر جمی ہوئی کائی کی اشکال میں اور ڈراؤنے خوابوں کی صورت بگڑتے بنتے ہرتے ہیں۔شعور کی اصل زبان وہ الفاظ ہیں جو شاعری کے خطّے میں آباد ہوتے ہیں۔شاعر اور شعور ان کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے۔ماضی کے گرد و غبار اور مستقبل کی دُھند اور کہرے اس کا سامنا ہوتا ہے۔جذبہ، خیال، اور تصوّر، ایک طرف۔ہوا،

چاندنی اور دھوپ دوسرے طرف۔ آفاق کی وسعتیں مستقبل بن کر نفس اور زمین کی تاریکیاں اور اس کی کلفتیں ماضی کا روپ دھار کر شاعر اور شعور کے سامنے کبھی ڈھکی چھپی اور کبھی ننگی حقیقتیں بن کر آ کھڑی ہوتی ہیں وہ زندگی کے ان جامد اور لامتناہی سلسلوں سے گزرتا ہے۔ ایسی الجھن میں کبھی وہ ماضی کی طرف لوٹتا ہے اور روایات کو آواز دیتا ہے۔ زمین اور شعور کی گہرائیوں میں دفن کی ہوئی خوشیوں اور اداسیوں کو لفظوں میں پردتا ہے اور کبھی مستقبل کے دُھندلے نقوش سے ہوا کے رُخ پر اپنے آپ کو انجانے بادلوں کے قافلوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ ماضی کے قافلوں کے گرد وغبار اور مستبقل کے دُھندلے نقوش اور بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک کی سوا جب اسے کچھ اور نظر آتا تو پھر وہ ہوا، چاندنی، دھوپ، جذبہ، خیال اور تصوّر اور اپنے وجود اور اپنے وجدان کو ساتھ لے کر، تو، کو پکارتا ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے کہ، تُو، کے سوا اور کوئی موجود نہیں۔ اس کے جسم دروح کا ذرّہ ذرّہ جب، تُو، کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک خلقِ جدید محسوس کرتا ہے اور اس کا کلام اور اس کا بیان، جدید، کی حدوں کو چھوتا ہے۔ وہ جدید، جس میں جدّت اور تجوید، وجود اور وجدان، حُسن اور عشق، میں اور، تُو، کا وصال ہوتا ہے۔

ناصر کاظمی من وتو کے اسی وصال کا شاعر ہے۔ اردو شاعری حُسن وشعق، من وتو اور وجود ووجدن کے جس بُعد کا شکار رہی، ناصر نے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بُعد کی اس خلیج کو پاٹ دیا ہے، پہلی بارش میں غزل اور نظم کا امتیاز اٹھ گیا ہے۔، میں، اور، تُو، کا وصال ہو گیا ہے۔ جدّت اور تجدید ہمآغوش نظر آتے ہیں اور روایت اور وجدان کے امتزاج نے زبان کے شعور کے مختلف علاقوں کو ایک کر دیا ہے۔

غزل روایت کی طرف جُھکتی ہے، ماضی کو آواز دیتی ہے، اسے فارسی اور عربی کی خوچہ چینی پر مباہات وافتخار رہا ہے اور نظم میں جدید دور کا اضطراب ہے۔ ناصؔر نے ان غزلوں میں جذبات اور تخیل میں سناکحت کا جو رشتہ استوار کیا ہے، اس سے دونوں کی اصل واضح بھی ہے اور غیر موجود بھی۔ اور یہ اس طرح ممکن ہوا کہ ناصؔر کسی بے روزن ودَر، دیوار سے اپنا سر نہیں پھوڑ رہا ہے، اس نے نفس کی انا کے خلا کو اپنے اور ماسوا کے درمیان سے دور کر لیا ہے۔ اس کو کوئی چیز دھوکا نہیں دیتی، وہ ہر چیز کو اپنی اصل میں دیکھتا ہے۔ اپنے نفس کی انا کو چھوڑ کر وہ سپردگی کے جس عالم میں ہے اس میں جذبات وتخیل کا بُعد مفقود اور من وتو کا امتیاز معدوم ہے۔ اسی عالمِ سپردگی میں شاعر، جدید، کی حدوں کو چُھوتا ہے۔ اس کے لیے وہ لمحہ پہلی بارش کے نزول کا لمحہ ہوتا ہے۔ اسے اس بارش کے ہر قطرے میں نامعلوم سے معلوم اور پھر معلوم سے نامعلوم تک کا سفر ہزار رنگوں اور ہزار داستانوں میں نظر آتا ہے۔ ناصر کاظمی کی یہ شاعری اردو کی پہلی بارش ہے اور ناصر کاظمی بزن اردو بارش کا پہلا قطرہ۔

غالب احمد

لاہور۔ یکم مارچ ۱۹۷۵ء

دیباچہ طبعِ سوئم

(۱)

میں سکول میں پڑھتا تھا۔ نیا نیا شعر کہنا شروع کیا تھا۔ ایک محبوب مشغلہ پاپا کی غیر موجودگی میں ان کے کمرے میں، ہر قسم کے نئے اور پرانے رسالے، کھنگالنا، تھا۔ (غیر نصابی کتابیں پڑھنے کا دور ابھی نہیں آیا تھا) ایک روز، نیا دور، کے دو مختلف شماروں میں پاپا کی کئی غزلیں ایک ساتھ ملیں۔ ان کے بارے میں انوکھی بات یہ تھی کہ یہ سب کی سب ایک ہی زمین میں تھیں۔ حیرت ہوئی کہ پاپا، جو ایک غزل میں ایک ہی قافیہ ایک سے زائد بار باندھنے سے گریز کرنے کو کہا کرتے تھے، خود ایک ہی زمین میں اتنی غزلیں لکھ گئے، اور کئی قافیے کئی کئی دفعہ استعمال کیے۔ اچھنبے کی دوسری بات یہ تھی کہ ان کی غزلوں کی زبان اتنی سادہ تھی کہ پہاڑ اور گلہری، اور گائے، بکری، کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور لب و لہجہ روز مرہ گفتگو کے اتنا قریب تھا کہ لگتا جیسے نثر کو اوزان کا پابند کر دیا گیا ہو۔ شعر کہنا بہت آسان دکھائی دینے لگا، کئی بار تو بے اختیار ہنسی بھی آ گئی اوزان کا پابند کر دیا گیا ہو۔ شعر کہنا بہت آسان دکھائی دینے لگا، کئی بار تو بے اختیار ہنسی بھی آ گئی

سینے پر دو کالی کلیاں
پیٹ کی جھیل میں کنول کھلا تھا

پاپا ریڈیو سٹیشن سے لوٹے تو میں نے انہیں دیکھتے ہی کہا، "پاپا! کچھ غزلیں پڑھیں آج۔ اوپر آپ کا نام تھا۔ آپ ہی کی ہیں؟"

ہاں ہاں میری ہیں، بالکل میری ____ کیوں؟ پاپا نے رسالے دیکھتے ہوئے کہا اور سنجیدہ پا کر انہیں تشویش ہونا شروع ہوئی کہ کل تک تو برخوردار بھلا چنگا تھا۔

بہت سیدھی سیدھی غزلیں ہیں ____ پھیکی پھیکی ____ کچھ زیادہ ہی آسان اور سادہ" میں نے ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا۔ " کوئی بھی لکھ سکتا ہے..... بات نہیں بنی۔"

اب سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں کہ ناصر کاظمی سے یہ بات اور وہ بھی پہلی بارش کیبارے میں، اس انداز سے _____ میں نے کہہ دی؟! پھر اپنی جہالت کو معصومیت کا نام دے کر دل کو تسلّی دیتا ہوں۔ نابالغ، نماز روزے کے علاوہ بھی بہت سی پابندیوں سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے حدود میں رہنا ناممکن ہوتا ہے کیونکہ وہ حدود سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ جہاں تک بیبا کی کا تعلق ہے تو ناواقفیت بھی اس کا تناہی اہم منبع ہے جتنا کہ علم۔ (اگرچہ جو جرأت لاعلمی سے پھوٹے وہ گستاخی اور ہٹ دھری کہلاتی ہے اور جو علم کے نتیجے میں

پیدا ہو وہ خود اعتمادی اور یقین کی علامت خیال کی جاتی ہے) پھر نا بالغوں اور ناواقفوں کو ایک اور رعایت بھی تو حاصل ہے۔ علم کا باب وا کرنے کی ایک کلید بیبا کی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جاننے اور سیکھنے میں شرم محسوس نہ کرو۔ پاپا بھی یہی تلقین کیا کرتے تھے۔ سوالوں کے جواب چاہو اور جواب سن کر سوال کرو۔ سوال کتنے ہی مضحکہ خیز اور بچگانہ کیوں نہ ہوں۔

تو ذکر تھا، پہلی بارش کی، کی غزلوا کا سری بات پر پاپا کا ردِعمل ایسا تھا گویا وہ کچھ بتانے یا سمجھانے بلکہ کچھ بھی کہنے کو بے سود سمجھ رہے ہوں۔

مذکورہ واقعے کے کئی برس بعد اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے جب پاپا نے اپنا کلام اکھٹا کر کے ترتیب دینا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ ایک ڈائری کے پہلے صفحے پر، پہلی بارش، جلی حروف میں لکھا ہوا تھا اور اگلے اوراق میں ویسی ہی ہم زمین غزلیں ایک پرانی ڈائری (جو میرے پاس اب بھی محفوظ ہے) سے نقل کر رہے تھے۔ اس پرانی ڈائری میں یہ غزلیں من وعن اسی طرح لکھی ہوئی تھیں جیسے میں رسالے میں پڑھ چکا تھا۔ مگر اب کئی اشعار قلم زد یا تبدیل کیے جا چکے تھے۔ کچھ نئے اشعار کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اور دو تین غزلیں خارج کر دی گئیں تھیں۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ یہ مجموعہ غزلوں کے ان مجموعوں سے بہت مختلف تھا جن سے میری آشنائی تھی۔ میں نے پاپا سے کہا کہ وہ اسے چھپوا کیوں نہیں دیتے تو ان کا جواب صرف اتنا تھا، "ابھی لوگ اس کے لیے تیار نہیں"۔

پاپا اکثر ہم سے، ہماری عمر کے اس دور کے مطابق جس سے ہم گزر رہے ہوتے، سوال کیا کرتے، ہمارا امتحان لیا کرتے، ایک روز رات کو اپنے لکھنے پڑھنے کے اوقات میں مجھے بلایا اور کہا، "اس شعر کے کیا معنی تمہاری سمجھ میں آتے ہیں؟"

دل کی صورت کا اک پتہ　　　　تیری ہتھیلی پر رکھا تھا

میں سوچنے لگا۔ پان کا پتہ میرے ذہن میں آ رہا تھا لیکن غزل کے شعر کے معنی ایک پہیلی کے حل کی طرح بتائے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

"دل کی صورت کا پتہ نہیں دیکھا کبھی؟"

"پان!" میں نے فوراً جواب دیا۔

"ٹھیک۔ اب شعر کو دیکھو

کاغذ کے دل میں چنگاری
خس کی زباں پر انگارہ تھا

"سگریٹ۔ ماچس۔"

خوب۔ اب یہ شعر

چاند کے دل میں جلتا سورج
سورج کے دل میں کانٹا تھا

یہ پہلی، میں نہ بوجھ سکا۔ آخر انہوں نے خود ہی بتایا: "فرائڈ انڈا"۔

بہت محفوظ ہوا۔ "تو کیا پہلیاں ہیں؟"

"ہاں۔ پہلیاں بھی۔" وہ مسکرانے لگے۔

یہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے لیے اہم سے اہم تر ہوتا چلا گیا ہر شے اپنے علاوہ (یعنی جو کچھ وہ دکھائی دیتی ہے یا سمجھی جاتی ہے، اس کے علاوہ) اور، بھی بہت کچھ نظر آتی۔ پاپا کا یہ شعر ہر وقت ذہن میں پھرنے لگا

پھول کو پھول کا نشاں جانو
چاند کو چاند سے ادھر دیکھو !

پھر ایک روز دل کی صورت کا پتہ ایک ہتھیلی پر رکھا دیکھا۔ سر بکف لوگوں کے بار۔ میں تو سنا تھا، دل بدست بھی دیکھ لیا۔ پھر، چاند، کے دل میں جلتا سورج، سورج، کے دل میں کانٹا کاغذی پیکر کے دل میں چنگاری اور خس، کی زباں پر انگارہ بھی دیکھا۔ اب ان اشعار میں پہلیاں کم اور کہانیاں زیادہ نظر آنے لگیں۔ میرے حیرت کے صحرا میں، پہلی بارش، سے نت نئے گل ہائے معانی کھلے جن باتوں پر پہلے ہنسی آئی تھی، اب آنسوؤں کے دریا بہتے۔ میر پر پاپا کا مضمون جو کبھی، سویرا، میں شائع ہوا تھا، (اور اب ان کے نثری مجموعے، خشک چشمے کے کنارے میں شائع ہوا ہے) پڑھا۔ اس شعر: "یاں پٹھن نکل گیا واں غیر / اپنی ٹکی لگائے جاتا ہے" کے حوالے سے پاپا کی خیال آرائی پڑھ کر مجھے اپنا پہلی بار، پہلی بارش، پڑھنا بہت یاد آیا۔ لکھتے ہیں: "بظاہر یہ شعر آدمی کے سستے اور عمودی جذبات کو اس قدر پرانگیختہ کر سکتا ہے کہ معقول قاری بھی ان کی رو میں بہہ کر اس طرح قہقے لگانے لگے کہ اسے اپنے مبتذل ہونے پر کوئی شک نہ رہے، ردِعمل کے طور پر ایسا معقول قاری بالکل ویران ہوسکتا ہے اور انہی ویران لمحوں میں یہ شعر اپنا آپا دکھاتا ہے۔ اس میں بھونڈے قہقوں کی گونج کے ساتھ وہ المناک تجربہ اپنی پوری شدت کے ساتھ سمویا ہوا ہے جس پر دھاڑیں مار مار کر رویا بھی جاسکتا ہے۔"

،پہلی بارش، دوبارہ، سہ بارہ پڑھی۔ یوں لگا جیسے کتاب اب سمجھ میں آ گئیں جس طرح کسی غزل کے اشعار اپنا جداگانہ وجود رکھتے ہوئے بھی آپس میں کسی طور پر منسلک ہوتے ہیں اسی طرح، پہلی بارش کی غزلیں بھی انفرادی طور پر مکمل غزلیں ہونے کے ساتھ ساتھ مل کر ایک طرح، پہلی بارش کی غزلیں بھی انفرادی طور پر مکمل غزلیں ہونے کے ساتھ ساتھ مل کر ایک وحدت کو تشکیل دیتی دکھائی دیں۔ یہ وحدت کو تشکیل دیتی دکھائی دیں۔ یہ وحدت طویل نظم کے قریب کی کوئی چیز معلوم دی۔ ہر غزل گویا اس نظم کا ایک بند تھی۔ جس کے اشعار ایسے مرطوط نظر آئے جیسے کسی زینے کے مدارج یا کسی منزل کے مراحل۔ ایسا محسوس ہوا گویا شاعر کوئی کہانی سنا رہا ہو۔ بار بار پڑھنے پر یہ کہانی واضح ہوئی چلی گئی۔

(۲)

صدیوں پرانی روایت ہے کہ شعراء (مغربی و مشرقی) طویل نظم کی ابتدا کدا یا دیوی دیوتاؤں (اپنے اپنے ایمان یا اعتقاد کے مطابق) سے خطاب کر کے کرتے ہیں۔ پہلی بارش، اور روایتی طویل نظم کا ایک اور مشترک وصف، آغاز ہے

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

اس شعر کے بارے میں پاپا خود کہا کرتے تھے کہ اس شمار چند بہترین حمدیہ اشعار میں ہوگا۔

اس کے علاوہ پہلی غزل، کہانی، کے، مرکزی کردار، کا تعارف بھی ہے۔ شروع ہی میں پڑھنے والا جان لیتا ہے کہ یہ ایک ایسے تخلیق شخص کی کہانی ہے جو اللہ کو ماننے والا اور اس کی کتاب کا بغور مطالعہ کرنے والا ہے۔ اللہ ہی کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے وہ قرآنی آیات پڑھ کر اوندھے منہ گر نہیں جاتا، اندھا دھند ایمان نہیں لے آتا، بلکہ تدبر کرتا ہے اور غور و فکر کے ذریعے ان آیات کو اپنے رگ و پے کا حصّہ بناتا ہے۔ وہ آدم کے مقام اور کائنات میں اس کے کردار۔ سے بخوبی واقف ہے:

میں وہ صبرِ صمیم ہوں جس نے
بارِ امانت سر پہ لیا تھا
میں وہ اسمِ عظیم ہوں جس کو
جن و ملک نے سجدہ کیا تھا

یہ شخص نہ صرف اللہ سے سوال کرنے کی بلکہ شکوہ کرنے کی بھی جرئات رکھتا ہے:

تو نے کیوں میرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا
پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

یہ اشعار غزلوں کے اس سلسلے میں بیان کی جانے والی کہانی کے موضوع کی طرف بھی ایک واضح اشارہ ہیں۔

یہاں اگر میں یہ کہوں کہ پاپا کی اپنی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنے دعوے کی حمایت میں ان ہی کے دو بیانات درج کرتا ہوں؛ سویرا، کے ایک مذاکرے میں، میرا ہمعصر (مطبوعہ) خشک چشمے کے کنارے) کے تحت لکھتے ہیں، "....... میں عصر کے قرآنی معانی پر توجہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اب اگر سلیم احمد صاحب یہ اعتراض کریں کہ میں ادب کے معاملے میں قرآن مجید کو بیچ میں کہیں لاتا ہوں تو میری گزارش ہے کہ میں قرآن کو ادب سمجھ کر پڑھتا ہوں اور اپنی زبان کے بعض لفظوں کے اصل معانی پر اس لیے بھی زور دیتا

ہوں کہ دورِ غلامی نے ہماری قومی علامتوں کا اس قدر مذاق اڑایا ہے کہ اب ہم ہر معاملے میں اہلِ مغرب کے دست نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مولوی، مولانا، حضرت، یہ الفاظ مغرب زدہ لوگوں کے لیے محض گالی یا پھبتی کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

اپنی زندگی کے آخری ایام میں ٹیلی ویژن کے لیے انتظار حسین کو انٹرویو دیتے ہوئے، غزل سنانے کی فرمائش کیے جانے پر انہوں نے کہا: "____ لایئے تمہیں کچھ شعر سنا دیتا ہوں یہ غزل اس میں تھوڑی سی خطابت ہے؛ مگر یہ ہے کہ بعض وجوہ سے مجھے پسند ہے؛ کہ طلوع غروب کے مناظر ہیں؛ حیرت و عبرت، کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے؛ کس طرح چیزیں ڈوبتی ہیں، ابھرتی ہیں؛ کس طرح صبح شام ہوتی ہیں؛ اور کچھ قرآنِ کریم کے پڑھنے والو کے لیے بھی ...... یہ کچھ دو چار شعر میں عرض کر دیتا ہوں:

سازِ ہستی کی صدا غور سے سن	کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن
دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان	شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سن
کیوں ٹھر جاتے ہیں دریا سرِ شام	روح کے تار ہلا غور سے سن!
یاس کی چھاؤں میں سونے والے	جاگ اور شورِ درا غور سے سن
کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال	شب گزیدوں کی دعا غور سے سن
کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں	کیا سناتی ہے صبا غور سے سن
دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے	میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سن

(برگِ نے)

یہاں اگر کوئی یہ کہے کہ شاعر کی شخصیت اور اس کے نظریات اور عقائد کی روشنی میں اس کے کلام کو دیکھنا، بے لاگ Objective مطالعے کے تقاضوں کے خلاف ہے تو میں جواب میں پاپا ہی کے الفاظ پیش کروں گا مذکورہ بالا انٹرویو ہی میں انہوں نے کہا تھا، "بات یہ ہے کہ جس طرح عطر کی شیشی آپ کھولتے ہیں تو خوشبو آپ کو آتی ہے، تو پھول اور باغ تو کہیں نظر نہیں آتے، تو شاعری میں میری، یہ تمام واقعات براہِ راست تو آپ کو نظر نہیں آئیں گے البتہ یہ ہے کہ وہ جو یادیں ہیں، جو زمانہ تھا ہماری غلامی کا اور جس میں ہم جینے کے لیے کوشش کر رہے تھے، ان کی تگ و دو کو میری شاعری کے آہنگ میں، رنگوں میں، لفظوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔" آگے چل کر اس سوال کے جواب میں کہ تمہارا Commietment کیا ہے، انہوں نے کہا، .... Commitment میں نے اس طرح بعض بیانات کی صورت میں تو شاید بہت کم کیا ہو، لیکن میرے کلام میں آپ کو ______ میرا تو خیال ہے کہ میں نے جو لفظ لکھا ہے وہ Commitment سمجھ کر لکھا ہے۔ پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ کو آپ دیکھیں اور میرے کلام کو دیکھیں تو ضرور اس میں وہ چیزیں دھڑکتی ہوئی نظر آئیں گی۔"

سجاد باقر رضوی کی کتاب کے دیباچے ،شہری فرہاد، میں وہ لکھتے ہیں، "شاعر کی شاعری اور اس کے نظریات کی ملاقات کسی مقام پر تو ہونی چاہیے۔اس ضمن میں باقاعدہ مثالیں تو مغرب کے ادب ہی میں ملیں گی لیکن اردو ادب بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں، میؔر نے اپنے تذکرے میں، غالبؔ نے اپنے خطوط میں، حالیؔ نے مقدمہ شعروشاعری میں، پھر ہمارے زمانے میں فراقؔ صاحب نے اپنے مضامین میں شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا عکس ان کی شاعری میں بھی موجود ہے.... شاعر اپنے نظریات کو مسلسل تجربات، مشاہدات اور مطالعے کے بعد مرتب کرتا ہے اور شاعری میں انہیں ذائقہ بنا دیتا ہے۔شاعر کا مطالعہ اور اس کے نظریات خام رے کی طرح ہوتے ہیں جو شعر میں دم شمشیر بن کر اپنا جوہر دکھاتا ہے"

یہاں یہ باتیں، ممکن ہے کچھ لوگوں کو غیر متعلقہ لگیں لیکن میرے خیال میں ان کا ذہن نشین ہونا نہ ف ،پہلی بارش، بلکہ ناصر کاظمی کی پوری شاعری کو سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

(۳)

وہ کوئی اپنے سوا ہو تو اس کا شکوہ کروں
جدائی اپنی ہے اور انتظار اپنا ہے
(دیوان ناصر کاظمی)

"پہلی بارش، کے شاعر کی کہانی یہ بتاتی ہے کہ انسان اس دنیا میں نہ صرف اکیلا آتا ہے اور یہاں سے اکیلا جاتا ہے، بلکہ وہ یہاں رہتا بھی اکیلا ہے۔اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد، اپنے اندر جھانک کر، اپنی ذات کی مسلسل نشونما (یا زکا) کرتے رہنے سے ہی وہ سکون کی منزل (یا جنت) تک پہنچ سکتا ہے۔انسان کی ضرورتیں اسے دوسروں کے پاس بھی لے جاتی ہیں اور ان سے جدا بھی کرتی ہیں۔ ہر تعلق اور دوستی کی ایک معیاد ہوتی ہے۔یہ میعاد تمام عمر پر بھی محیط ہو سکتی ہے، بشرطیکہ فریقین ایک دوسرے کی نشونما میں اضافے کا باعث بنتے رہیں (اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اپنی نشونما کے لیے بھی کوشش کرتے رہیں۔ظاہر ہے جو خود رک گیا، وہ کسی کو کیا آگے بڑھائے گا)۔لیکن جب روز کے ملنے والے دوست ایک دوسرے کی نشونما میں مزید کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے تو ان کا ملنا کم ہونے لگتا ہے۔ انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں:

دوست بچھڑے جاتے ہیں شوق لیے جاتا ہے دور! (برگِ نے)

اب ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ناصؔر
وہ ہم نوا جو مرے رتجگوں میں شامل تھے
(دیوان)

محبت کا معاملہ اس سے کچھ مختلف نہیں۔محبوب کے بغیر ایک پل نہ جی سکنے والا، یوں بھی سوچتا ہے:

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو
(دیوان)

شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے　　دل تجھے بھی بھلائے جاتا ہے　　(دیوان)

اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ:

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں
(برگِ نے)

وہ رشتہ جواز خود، بتدریج اور غیر محسوس طور پر ٹوٹے؛ وہ دستی جو اپنے تمام امکانات کو Explore اور Exhaust کر لے، اس کا دکھ یا ملال نہیں ہوتا، لیکن جو تعلق ادھورا رہ جائے درمیان میں کسی حادثے رنجش، بدگمانی، غلط فہمی، رقابت یا ظالم سماج کی وجہ سے منقطع ہو جائے۔ بہت تڑپاتا ہے:

کہا ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے!
(برگِ نے)

یاد آتا ہے روز و شب کوئی　　ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی
(برگِ نے)

"پہلی بارش کے آغاز میں کیفیت تو من شدی من تو شدم کے مصداق نظر آتی ہے۔ دو رنہ حوں کا پیاسا بادل گرج گرج کر برستا ہے، دریا دوں کا چڑھتا دریا ایک ہی ساگر میں گرتا ہے اور دل کی کہانی کہتے کہتے رات کا آنچل بھیگ جاتا ہے۔ سفر کی رات خوشبو کے جھونکے کی مانند گزر جاتی ہے دن کی ٹھنڈی دھوپ میں، تیری ہلال سی انگلی پکڑے / میں کوسوں پیدل چلتا تھا" اور پچھلے پہر کے سناٹے میں، "تیرے سائے کی لہروں کو / میرا سایا کاٹ رہا تھا،" غرض، "وقت کا ٹھاٹیں مارتا ساگر / ایک ہی پل میں سمٹ گیا تھا،" لیکن فراق کی منزل دور نہ تھی :

کیسی اندھیری شام تھی اس دن　　بادل بھی گھر کر چھایا تھا!
رات کی طوفانی بارش میں　　تو مجھ سے ملنے آیا تھا!
بھیگی بھیگی خاموشی میں　　میں ترے گھر تک ساتھ گیا تھا

ایک طویل سفر کا جھونکا مجھ کودور لیے جاتا تھا!

یہ کیسی خاموشی ہے! کیا باتیں ختم ہو گئیں! کیا تمام یادوں اور سپنوں کا تبادلہ ہو چکا! یا یہ باتوں کے درمیان محض ایک وقفہ ہے؟

یہ کیسا سفر ہے! غمِ روزگار کی مجبوری، زمانے کی عائد کردہ پابندی یا ذات کی داخلی احتیاج! اگلی غزل میں ان سارے سوالوں کے جواب مل جاتے ہیں، مطلع میں دوبارہ کا لفظ بہت اہم ہے یہاں اس کا مطلب دوسری بار نہیں بلکہ ایک بامعنی (Significant) وقفے کے بعد آنا ہے گھر وہی، شام کا تارا وہی، رات وہی، سپنا وہی، مگراب تیرے لیے لمبی تان کر پہروں سونا ممکن ہے تو اس کے برعکس، تیری نیند بھی اڑی اڑی تھی، (غزل نمبر۲)، مجھ سے بے نیاز ہونے کے عمل میں مقام آ چکا ہے۔ پھر اس نیند کو بھی، ایک انوکھے وہم کا جھونکا، اڑا اڑا دیتا ہے اور ایک دن یہ وہم تجھ کو گھیر لیتا ہے اور تو، مجھ کو سوتا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

لیکن یہ وہم کیا تھا؟ ایک نظریہ یہ ہے کہ ہر خیال وہم ہوتا ہے ______ "یہ تو ہم کا کارخانہ ہے/ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا" ______ جبکہ دوسرے زاویے سے دیکھیں تو وہم بھی ایک خیال ہی ہوتا ہے۔ دراصل ہم وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر بات کے دورخ ہوتے ہیں جب ہم کسی سے دور ہونا چاہتے ہیں تو اس کی باتوں کے وہی معانی ہماری سمجھ میں آتے ہیں جو ہمارے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھاتے ہوں (چاہے وہ ہمیں دل و جان سے چاہتا ہو) بصورت دیگر وہ معانی جو ہمیں اس کے قریب لے جاتے ہوں (خواہ وہ ہم سے کتنا ہی بیزار ہو پر اس کے دل کی بات ہمیں بہت بعد میں پتہ چلے گی۔ پہلی بارش، میں بھی آخری غزل میں ایک ایسا ہی انکشاف ملتا ہے:

تیر اقصور نہیں میرا تھا میں تجھ کو اپنا سمجھا تھا

____

اب میں سمجھا، اب یاد آیا تو اس دن کیوں چپ چپ سا تھا

سو یہ اہم نہیں کہ یہ وہم کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ربط ٹوٹ چکا ہے۔ اس کا علم ابھی پوری طرح اس لیے نہیں ہوا کیونکہ جسمانی فاصلہ ابھی کم ہے۔ ایک مثال اس بات کی وضاحت کر سکے گی۔ اگر دو برابر کے پہیے ایک Tie-rod سے جڑے، ایک ہموار اور سیدھے راستے پر پہلے جا رہے ہوں اور یہ Tie-rod ٹوٹ جائے (بغیر جھٹکے کے) تو تب بھی وہ ساتھ ساتھ اسی طرح چلتے جائیں گے اور کسی کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ ان کا آپس میں تعلق منقطع ہو چکا ہے ذرا کہیں ناہموار سطح آئی اور یہ دونوں یا تو آپس میں ٹکرائے یا پھر مخالف سمتوں میں لڑھک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ اگرچہ گھومتے گھومتے وہ دوبارہ بھی ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں لیکن ملنے کے لیے نہیں بلکہ پھر بچھڑنے کے لیے۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ، میری، کیفیت میں ہنوز کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تو نے ممکن ہے خوب تجزیے اور غور و فکر کے بعد رختِ سفر باندھا ہو لیکن میرے خیال میں تجھے وہم ہی ہوا ہے تیرے آنے پر میں تیرا، منتظر تھا اور وُ ہی، سپنا دیکھ رہا تھا۔ تو سو جاتا تو پہروں تجھے تکتا رہتا، تیری ایک صدا سنتے ہی گھبرا کر جاگ اٹھتا اور جب تک تجھ کو نیند نہ آ جاتی، تیرے پاس کھڑا رہتا: ماحول کو دلچسپ بنانے کی خاطر

اور تیرے بیزار ہو جانے کے ڈر سے نئی انوکھی بات سنا کر تیرا جی بہلاتا، اس آرزو میں اور اس امید پر کہ تیرے دل میں جانے کا خیال نہ آئے۔ میرے لیے وقت اتنی تیزی سے گزر گیا کہ ایک مہینہ ایک پل کے برابر محسوس ہوا۔ میرے لیے ابھی اس تعلق میں بہت کچھ باقی تھا، تیری طلب کم نہ ہوئی تھی، اسی لیے:

آنکھ کھلی تو تجھے نہ پا کر　　میں کتنا بے چین ہوا تھا

آج وہ سیڑھی سانپ بنی تھی　　کل جہاں خوشبو کا پھیرا تھا

اگلی غزل، میری اور تیری، ان کیفیات کی مزید نمایاں کرتی ہے:

تجھ بن گھر کتنا سُونا تھا　　دیواروں سے ڈر لگتا تھا

بھولی نہیں وہ شامِ جدائی　　میں اس روز بہت رویا تھا

تجھ کو جانے کی جلدی تھی　　اور میں تجھ کو روک رہا تھا

تجھ سے بچھڑ کر 'میری' حالت غیر ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے خیال ستاتے ہیں۔ سناٹے میں کوئی دور سے آوازیں دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ باہر کے مناظر کچھ کے کچھ دکھائی دیتے ہیں۔ نیند بھی خوف اور وسوسوں سے خالی نہیں ہوتی۔ بارہویں غزل میں ایسے ہی ایک ڈراؤنے خواب کا بیان ہے۔

تیرہویں غزل میں کہانی کا مرکزی کردار یا، ہیرو، تنہائی کے آتش دان میں لکڑی کی طرح جلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی خوشی اور تسکین کے لیے وہ اپنے سے باہر دکھنے کا عادی اور محتاج ہے۔ ابھی اس نے اپنے اندر جھانکنا شروع نہیں کیا۔ اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ دوزخ اس مقام کو بھی کہتے ہیں جہاں فرد یا معاشرے کی نشو و نما رک جائے۔ اس وقت 'ہیرو' کی یہی کیفیت ہے۔ اسے جینا محال نظر آتا ہے______"دم ہونٹوں پر آ کے رُکا تھا/ یہ کیسا شعلہ بھڑکا تھا." زندگی میں اس کی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ اب اسے باہر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا:

میری آنکھیں بھی روتی تھیں!　　شام کا تارا بھی روتا تھا!

گلیاں شام سے بجھی بجھی تھیں　　چاند بھی جلدی ڈوب گیا تھا

لیکن خوش قسمتی سے اس کا دم نکل نہیں جاتا بلکہ حیات سے اس کا رشتہ بحال ہو جاتا ہے

قیامت رہا اضطراب ان کے غم میں
جگر پھر گیا رات ہونٹوں تک آ کر

جانکنی کے عالم میں اسے دوزخ کی ایک واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ "آگ کے سپنے اسے ایک رسیلے جرم کا چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ اسے احساس ہوتا کہ وہ زندگی جیسی نعمت سے لاپرواہی برتنے کا مجرم بن رہا ہے۔ اسے اپنی وہ امکانی حالت نظر آتی ہے جو مسلسل بے مقصد جلتے

کڑھتے رہنے سے ہوسکتی ہے:

پیاسی لال لہوسی آنکھیں رنگ لبوں کا زرد ہوا تھا
بازو کھینچ کر تیر بنے تھے جسم کماں کی طرح ہلتا تھا
ہڈی ہڈی صاف عیاں تھی پیٹ کمر سے آن ملا تھا!
وہم کی دیمک نے چہرے پر مایوسی کا جال بُنا تھا
جلتی سانسوں کی گرمی سے شیشہ تن پگھلا جاتا تھا

مایوسی جہنم کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔لفظ ابلیس، بلس، سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں، مایوسی، ابلیس، وہ جو مایوس ہوگیا۔ وہ آدم کے ارض پر خلیفہ بنائے جانے پر مایوس Disappoint ہوا؛ اور جو خود مایوس ہو جائے وہ دوسروں کو بھی مایوس کرتا ہے، ان کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے؛ اور جنہیں اس سے پناہ نہ مل سکے، جو اس کے بہکاوے میں آجائیں، ان کا مقدر بھی دوزخ ہے

'پہلی' بارش، کا ہیرو اس انجام سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں جسمانی زندگی کی حدیں ختم ہونے لگتی ہیں اور موت دکھائی دینے لگتی ہے۔ سزا اور جزا کی منزل آجاتی ہے۔ اسے حیات بعد الموت کا وجود محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ ڈر جاتا۔ اسے زندگی کا وقفہ بہت غنیمت نظر آتا ہے۔ اس کے اندر جینے کی شدید خواہش اور طلب پیدا ہوتی ہے_____، پیاسی کونجوں کے جنگل میں / میں پانی پینے اترا تھا۔"

کونج (یا قاز) ایک ایسا پرندہ ہے جو موسمِ سرما میں گرم خطوں میں چلا آتا ہے اور اس کے غول دریا کے کناروں پر ملتے ہیں اور قطار باندھ کر اڑتے ہیں۔ گویا یہ حرارت اور پانی یعنی حیات کے لیے ناگزیر عناصر کا طالب اور متلاشی رہتا ہے۔ ایک تخلیقی آدمی کی زندگی بھی تلاش اور جستجو سے عبارت ہوتی ہے۔ نادیدہ کے درشن کی پیاس اور نا آفریدہ کی تخلیق کی لگن اسے سرگرداں پھراتی ہے۔ یہ دنیا اس کے لیے، پیاسی کونجوں کا جنگل، ہے۔ کونجوں اور تخلیق انسانوں کی ہم سفری اور ہم نوائی کا ذکر، ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے مکالمے، دنیا اسیم، (مطلوعہ، سویرا) کے پیش لفظ میں نہایت واضح اور بھرپور طور ملتا ہے۔", جب چلتے چلتے ہنگامِ زوال آیا، دل نڈھال ہوا اور حال بے حال ہوا۔ ایک سوار نے سمندِ عزم کی باگ چھوڑی اور بولا کہ اس بیابان میں سفر بے اثر ہے، خاک پھانکنا بے ثمر ہے۔ خیال ترک کریں اور پلٹ کر بچھڑوں سے جا ملیں۔

ہم سفر بولا کہ جس راستے کو ہم نے چھوڑا وہ ہم پر بند ہوا۔ آگے کی راہیں کھلی ہیں، شوقِ سفر شرط ہے اور ہر قدم راستہ بھی ہے اور منزل بھی۔

انہوں نے باگیں سنبھالیں اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ اوپر تانبا آسمان، نیچے چٹیل میدان ہنسان بیابان، دھوپ میں جلتے بلتے پتھریلے ٹیلے، ریت کے رستے، اکا دکا بے برگ درخت، کوئی راہ گیر نظر نہ آیا کہ سُراغ منزل کا لیتے اور پتا پانی کا پاتے۔ دور کبھی دھول اڑتی نظر آتی تو خیال گزرتا کہ اس دشتِ بے آب میں مسافر بھی ہیں کہ اپنے طور کڑے کوسوں کا سفر کرتے ہیں۔ دن ڈھلنے لگا تو دل فزوں نڈھال

ہوا۔گلا پیاس سے خشک ہوااورابلق پسینے میں شرابوراور تھکن سے چورہوئے کہ اتنے میں سر پہ پیاسی آوازوں کی لکیر ہویدا ہوئی۔دیکھا کہ قازوں کی ایک قطار ہے کہ قائیں قائیں چیختی ہےاورفضامیں تیرتی جاتی ہے۔اس آواز کوانہوں نے غیب کی ندا جانااور پانی کا پیغام سمجھا۔ گھوڑوں کوایڑ دی اور قازوں کی ندا کے ہم رکاب بول سرپٹ دوڑے کہ ابلقوں کی ٹاپوں سے دشت گونجااور چنگاریاں اڑیں۔

یہ پیش لفظ مذکورہ غزل میں داخلے کا راستہ بن سکتا ہے۔اس غزل میں آگ کے مقابلے میں پانی دکھائی دیتا ہے۔جھلستے اور جلتے رہنے کے بعد یہ پانی اسے اتنا ٹھنڈا لگتا ہے کہ اس کے ہاتھ دیر تک کانپتے رہتے ہیں۔وہ پانی میں جھانکتا ہے تو اسے اپنے بھیتر کی گہرائیاں اور وسعتیں نظر آتی ہیں۔اس کی آنکھیں جھانکتی ہی چلی جاتی ہیں۔زندگی کے تقاضوں اور مرحلوں کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا جسم تھک کر چور ہو جاتا ہے۔پانی اسے للکارتا ہے۔پانی اتنا چپ چپ اور گم سم ہے گویا باتیں کر رہا ہو(مجھ سے باتیں کرتی ہے / خاموشی تصویروں کی (دیوان)} وہ پہلی بار اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔

اب وہ ایک نئے دیس میں اترتا ہے جہان کا رنگ، (اس کے لیے) نیا ہے یہاں دھرتی سے آکاش ملاتھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ارض وسما کے قوانین میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے Interpenetrate کرتے ہیں۔(انسانوں نے ارض وسما کو ہمیشہ بالکل الگ الگ اور ایک دوسرے سے لاتعلق قرار دیا ہے، حالانکہ ارض وسما کے بہت گہرے رشتے ہیں۔ ہر طرح کی نعمتوں کا نزول سما سے ارض پر ہوتا ہے) یہاں انسانوں کے لیے نہ صرف افقی بلکہ عمودی یا ارتقاعی ترقی کے لامتناہی اور مسدد امکانات کھلے ہیں۔وہ جس حد تک چاہیں آگے جاسکتے ہیں جتنا چاہیں بلند ہوسکتے ہیں۔

یہاں دور کے دریاؤں کا سُونا، ہرے سمندر میں گرتا ہے چلتی ندیاں ہیں اور گاتے نوکے پانی کی بہتات کا یہ عالم ہے کہ سارا شہر گویا نوکوں ہی میں بسا ہے۔یہاں پانی اور زندگی واضح اور مکمل طور پر ایک ہو جاتے ہین۔شاید 'پانی' ہی کی طلب اسے یہاں لائی ہے۔وہ ابھی تک تشنہ ہے----"ہنستا پانی، روتا پانی / مجھ کو آوازیں دیتا تھا۔" نئے دیس میں اترنا ایک نئے جیون کا آغاز کرنے کے مترادف لگتا ہےۓ۔وہ گھر، رات، اور وہ سپنا، اب ماضی کا حصّہ بن چکا ہے۔تیرا دھیان، مفلوج کرنے کی بجائے سہارا دیتا ہے۔اسے زندگی کے دریا کی لہروں کا مقابلہ کرنے کی جرئات اور شکستی دیتا ہے______"تیرے دھیان کی کشتی لے کر / میں نے دریا پار کیا تھا۔"

اس کے بعد وہ اک بستی میں اترتا ہے جو غالباً اسی نئے دیس میں ہے۔سر ماندی کے گھاٹ پہ جاڑے کا پہلا میلا ہے۔رقص وسرود کی محفل سجی ہے۔کچھ خوشبو لے کر وہ اس بستی سے نکلتا ہے۔لیکن:

تھوڑی دیر کو جی بہلا تھا پھر تیری یاد نے گھیر لیا تھا
یادی آئی وہ پہلی بارش جب تجھے ایک نظر دیکھا تھا

______ ______

یاد آئیں کچھ ایسی باتیں: میں جنھیں کب کا بھول چکا تھا

اگلی غزل میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا تیرے شہر سے پھر گزر ہوتا ہے۔ہوا اتنی تیز اور اداس ہوتی ہے کہ اس کا چراغ دل بجھ جاتا ہے

اس کا دل ہنوز سونا ہے اور تنہائی پیاسی جنّت ابھی دور ہے۔ اسی عالم میں تجھ، سے مشابہ ایک مسافر ریل چلنے پر اس کے مقابل آ بیٹھتا ہے۔ یہ مشابہت کچھ دیر کے لیے وجہِ تسکین بنتی ہے لیکن جدائی کا موڑ ہر سفر میں ہوتا ہے۔ تیزی طرح تیرا بدل، بھی بچھڑ جاتا ہے۔

کوئی بھی ہمسفر نہ تھا شریکِ منزلِ جنوں
بہت ہوا تو رفتگاں کا دھیان آ کے رہ گیا

وہ شخص جس سے تعلق اپنے فطری انجام کو پہنچ کر ٹوٹا ہو جس سے دوستی اپنے تمام امکانی طے کر چکی ہو، عرصہ دراز کے بعد ملے تو ایک انجانی سی خوشی ہوتی ہے۔

پھر ایک طویل ہجر کے بعد
صحبت رہی خوشگوار کچھ دیر !
(برگِ نے)

کوئی نیا موضوع نہ بھی چھڑے، کوئی نئی بات نہ بھی ہو، یادیں ہی تازہ ہو کر نئی بہار دکھا دیتی ہیں۔ ماضی اتنی قوت اور شدت سے رگ و پے میں داخل ہوتا ہے کہ مردہ لمحے زندہ ہو جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہیکو یا کوئی کھوئی ہوئی قیمتی متاع پھر مل گئی ہو۔ حالانکہ دل نے کبھی اس سے دوبارہ ملنے کی تمنا نہیں کی ہوتی، پھر بھی اس سے ملاقات ہونے پر ایسی خوشی ہوتی ہے جیسے کوئی خواہش پوری ہو گئی ہو۔ ظاہر ہے، اس سے جدا ہونے پر کوئی زخم لگا ہوتا تو اب ہرا ہوتا۔ یادوں کے پھول ہوتے ہیں، مہک اٹھتے ہیں۔

اس کے برعکس عجیب بات ہے کہ ایسا شخص جس کے فراق میں آدمی ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتا رہا ہو جس کی ایک جھلک دیکھنے کو آنکھیں پتھرا گئی ہوں، مل جائے تو رنج کم نہیں ہوتا۔ بقول حفیظ ہوشیارپوری۔

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

دیوان میں بھی ایک شعر ہے۔

تجھ سے مل کر بھی دل کو چین نہیں
درمیاں پھر وہی سوال پڑا

Heraclitus نے کتنا درست کہا ہے: ہم ایک ہی دریا میں دو بار قدم نہیں رکھ سکتے۔ "وقت ہر لحظ ہم میں اور کائنات میں تبدیلیاں لاتا چلا جاتا ہے۔ ہمیں پرانی قیود سے رہا کر کے نئے تقاضوں کی زنجیروں میں باندھ دیتا ہے۔ ہمارے شوق، حاجتیں، پسند ناپسند بدلتے رہتے ہیں مگر وہ تعلق جو ادھورا رہ جاتا ہے، ویسے کا ویسا رہتا ہے جو دوست بچھڑ جاتا ہے، ہمیں اسی طرح یاد رہتا ہے جیسا کہ وہ تھا۔ وہ ہمارے ذہنوں میں پروان نہیں چڑھتا۔ چنانچہ جب ہم اس سے ملتے ہیں تو وہ حقیقت میں تو کچھ کا کچھ ہو چکا ہوتا ہے لیکن ہماری نظریں اسی کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں جس سے ہم جدا ہوئے تھے۔ وہ کہیں ہو تو طے۔ رنج اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس کے ملنے کی جو ایک موہوم سی امید

ہوتی ہے وہ بھی دم توڑ دیتی ہے۔ وہ مل کر بھی نہیں ملا۔

کوئی اور ہے نہیں تو نہیں مرے روبرو کوئی اور ہے
بڑی دیر میں تجھے دیکھ کر یہ لگا کہ تو کوئی اور ہے (دیوان)

اب یہ اور بات ہے کہ ہم اس ملاقات میں دل کی تسلّی کے لیے بھی کوئی پہلو ڈھونڈ لیں۔

دیاروں کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا (دیوان)

مگر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آمنا سامنا ملاقات نہیں کہلا سکتا اور اگر اسے ملاقات کہا بھی جائے تو بھی:

چاند نکلا تھا مگر رات نہ تھی پہلی سی
یہ ملاقات، ملاقات نہ تھی پہلی سی!
(دیوان)

اور دو چار بار ایسا، آمنا سامنا، اور ہو جائے تو کیفیت بالآخر یہ ہو جاتی ہے۔

برابر ہے ملنا نہ ملنا ترا
بچھڑنے کا تجھ سے قلق اب کہا
(برگِ نے)

'پہلی بارش، کے مرکزی کردار کو بھی ایسی ہی ایک اتفاقی اور غیر متوقع، ملاقات کا بھرپور تجربہ ہوتا ہے:

پل پل کانٹا سا چبھتا تھا یہ ملنا بھی کیا ملنا تھا
کتنی باتیں کی تھیں لیکن! ایک بات سے جی ڈرتا تھا
تیرے ہاتھ کی چائے تو پی تھی دل کر رنج تو دل میں رہا تھا
کسی پرانے وہم نے شاید تجھ کو پھر بے چین کیا تھا
میں بھی مسافر تجھ کو بھی جلدی گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا
اک اجڑے سے اسٹیشن پر تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا

تیرے ساتھ ترے ہمراہی میرے ساتھ مرا رستا تھا
رنج تو ہے لیکن خوشی ہے اب کے سفر ترے ساتھ کیا تھا

وہ ملاقات کی بدل ہوئی نوعیت سے نہ صرف پوری طرح واقف ہو جاتا ہے بلکہ اسے قبول بھی کر لیتا ہے اور محض کچھ دیر کی جسمانی ہمراہی کو

غنیمت جانتا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ ہم سفری کی آرزو نہ صرف بے سود بلکہ باعثِ رنج بھی ہے۔

تعلق کی اصل نوعیت کا شعور اپنی داخلی اور خارجی تبدیلیوں کا علم اور قبولیت اسے دوزخ سے مکمل طور پر نکال لیتے ہیں۔ آ گہی کی بدولت اسے جنت کا نقشہ دکھائی دیتا ہے جہاں ہریالی ہی ہریالی ہے، نور ہی نور، رس ہی رس، مٹھاس ہی مٹھاس؛ جہاں کوئی وسوسے پیدا کرنے والا نہیں بلکہ، سایا سایا راہ نما ہے، جہاں گاتے پھول، ہیں اور بلاتی شاخیں، ہیں اور پتا پتا دستِ دعا ہے۔

اور یہ جنت اسے جلد ہی بھی جاتی ہے۔ تنہائی میں دریا دریا روتے ہوئے اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ تنہائی کا تنہا سایا دیر سے اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ جب سارے ساتھی چھوڑ گئے تھے تو تنہائی کا پھول کھلا تھا۔ تنہائی میں یادِ خدا بھی تھی اور خوفِ خدا بھی۔ تنہائی محرابِ عبادت بھی تھی اور منبر کا دیا بھی؛ اس کا پائے شکستہ بھی تھا اور دست دعا بھی۔ غرض اس کا سب کچھ تنہائی میں تھا، اس کا سب کچھ تنہائی تھی۔ وہ جنت جسے وہ باہر ڈھونڈ رہا تھا، اس کے دل میں چھپی تھی۔ وہ تسلیم کر لیتا ہے کہ تنہا تھا اور تنہا ہے۔ اس کے دل کی جنت تنہائی ہے۔

جنت کی دریافت اور حصول کے بعد وہ تجھ سے اپنے تعلق کا ایک بار پھر جائزہ لیتا ہے۔ اب اسے یہ رشتہ اپنے صحیح رنگوں میں نظر آتا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ قصور اس کا ہی تھا جو وہ تجھ کو اپنا سمجھا تھا اب پتہ چلا کہ، وہ سب کچھ ہی دھوکا تھا: حقیقت کچھ اور ہی تھا۔ آخریں وہ اپنی، تقدیر، کو قبول کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

وہی ہوئی ہے جو ہوئی تھی وہی ملا ہے جو لکھا تھا!
دل کو یونہی سا رنج ہے ورنہ تیرا میرا ساتھ ہی کیا تھا

کس کس بات کو رووٗں ناصؔر
اپنا لہنا ہی اتنا تھا !

لیکن اس سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ کائنات میں ازل سے ابد تک جو کچھ ہونا ہے وہ پہلے سے طے شدہ ہے ،لکھا جا چکا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم نہیں کی جا سکتی، ہمیں یاد رکھا چاہیں کہ اس نے پہلی ہی غزل میں کہا تھا اور وہ بھی خدا کو مخاطب کر کے کہ رہ ایسا صبرِ صمیم ہے جس نے اپنی مرضی سے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے بارِ امانت سر پہ لیا تھا۔ وہ جانوروں کی طرح ایک ہی بات کرنے پر ایک ہی راہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں۔ اسے انتخاب کرنے کا Privilege حاصل ہے وہ ایسا اہم عظیم ہے جس کو جن و ملک نے سجدہ کیا تھا۔ اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ:" جو پایا ہے وہ تیرا ہے / جو کھویا وہ بھی تیرا تھا"، تو اس سے لاچاری کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ تو صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ سب کچھ اللہ کی ملکیت ہے؛ انسان اس میں سے کچھ پا لیتا ہے، کچھ کھو دیتا ہے، اس کی خواہشوں کی تکمیل کا دارومدار اس کے اپنے فیصلوں اور اپنی کوششوں پر ہے:

دیکھ کے تیرے دیس کی رچنا میں نے سفر موقوف کیا تھا

نئی انوکھی بات سنا کر اور تیرا جی بہلاتا تھا

تجھ کو جانے کی جلدی تھی اور میں تجھ کو روک رہا تھا

ایک ہی لہر نہ سنبھلی ورنہ میں طوفانوں سے کھیلا تھا

انسان کے خیالات، اس کا اندازِ نظر، اس کی زندگی کو دوزخ بھی بنا سکتے ہیں اور جنت بھی جنت تلاش کرنے پر ملتی ہے۔

وہ جنت مرے دل میں چھپی تھی
میں جسے باہر ڈھونڈ رہا تھا

اس کا نظریۂ تقدیر ہے کہ ہر گوشے کی حدود ہوتی ہیں اور ان حدود سے جھگڑنا، انہیں توڑنے کی کوشش کرنا نہ صرف بے سود بلکہ مضر بھی ہے اور ان کو جاننے اور تسلیم کر لینے ہی میں فلاح ہے:

ان سے الجھ کر بھی کیا کرتا تین تھے وہ اور میں تنہا تھا

میں بھی مسافر کو بھی جلدی گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا

اب تجھے کیا یاد دلاؤں اب تو وہ سب کچھ ہی دھوکا تھا

دل کو یونہی سا رنج ہے ورنہ تیرا میرا ساتھ ہی کیا تھا

"وہی ہوئی ہے جو ہونی تھی، سے مراد ہے کہ جو کچھ ہو سکتا تھا وہی ہوا ہے علت اور معلول میں ایک ناگزیر رشتہ ہوتا ہے۔ وہی ملا ہے جو لکھا تھا، ور اپنا لہنا ہی تنا تھا کے معنی ہیں کہ جو بویا تھا وہی کاٹا جو کیا تھا اس ہی کا صلہ ملا۔ انسان کو ملی ہوئی صلاحیتوں کے کئی (مگر تعداد یں مقرر امتزاجات ممکن ہیں، مگر وہ ان میں سے ایک ہی کا انتخاب کر سکتا ہے اور کچھ چننے کے لیے بہت کچھ چھوڑنا بھی پڑتا ہے۔ انسان کا اختیار اس کی مجبوری بھی ہے اور اس کی مجبوری ہی میں اس کا اختیار مضمر ہے۔ زندگی ہر لحظہ چننے اور مسترد کرتے رہنے کا نام ہے لیکن انسن ایک بار فیصلہ کر لے اور اس کے مطابق عمل پیرا تو پھر اس عمل کے عواقب کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ انتخاب سے پہلے آدمی کے سامنے کئی راہیں کھلی ہوئی ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک پر چل نکلنے کے بعد باقی تمام اس کے لیے بند ہا جاتی ہیں۔ اب اگر بعد کو اسے یہ علم یا احساس ہو کہ

اس کا فیصلہ غلط تھا؛ یا اسے چھوڑی ہوئی راہوں میں کشش محسوس ہونے لگے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مجبور اور بے بس ہے انسان ہر وقت ہر جگہ نہیں ہوسکتا۔ وہ سب کچھ کر نہیں سکتا، وہ سب کچھ ہو نہیں سکتا۔

(۴)

آشنا درد سے ہونا تھا کسی طور ہمیں
تو نہ ملتا تو کسی اور سے بچھڑے ہوتے

'پہلی بارش' محض دو اشخاص کے ملنے اور بچھڑنے کی کہانی نہیں ہے۔ 'میں' اور 'تو' علامتیں ہیں داخلی اور خارج کی؛ نمائندے 'میں' فرد اور معاشرے کے۔ "انسان کو معاشرے اور تنہائی دونوں کی ضرورت ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے زوج ہیں یا اس کی زکا دونوں کی صحیح ترکیب ہی سے ممکن ہے۔ شاید اسی لیے انسان دوسرے انسان سے جدا ہو کر تنہا ہو کر، رفع حاجت کے بے جانے ہیں، وہاں وہ خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہاں ان کو عجیب عجیب حاجت کے لیے جانے ہیں۔ وہاں وہ خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہاں ان کو عجیب عجیب باتیں سوجھتی ہیں جن تک ان کے شعور کی رسائی نہیں ہوتی۔ مارٹن لوتھر نے اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ محبت کی پرورش کے بے بھی تنہائی اور خاموشی کی ضرورت ہے۔" [اقتباس از ناصر کاظمی: ایک دھیان، از شیخ صلاح الدین] لیکن عام آدمی تو تنہائی سے بھاگتا ہے۔ وہ اسیر بزم، ہوتا ہے۔ "تنائی عام آدمی کو اس لئے ڈراتی ہے کہ اس دنیا کے ہنگاموں کا شور ماند پڑ جاتا ہے اور کان خاموشی کا نغمہ سننے کی تاب نہیں لا پاتے، اس کے لیے دل کے کان کھولنے پڑتے ہیں۔ عام آدمی کو یہ عمل حالتِ نزع کے مشل نظر آتا ہے۔ وہ گھبرا جاتا ہے، تنہائی سے نکل بھاگتا ہے اور اپنے آپ کو ہجوم میں گم کرنے کی کوشش کرما ہے۔" چنانچہ خیالات اور جذبات کی پرورش کے لیے قدرت نے انسان کو لازماً بلکہ جبراً تنہائی خاموشی کے لمحات میں ڈالنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ حادثات بیماریاں، پیاروں کا بچھڑنا وغیرہ، ایسے واقعات ہیں جو اسے درد سے آشنا کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف اور کٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔ لوگوں کی صحبت میں اس کا جی نہیں لگتا بعض اوقات تو اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ درد اسے کانٹے کی طرح مسلسل ہمہ وقت چبھتا رہتا ہے۔ زندگی بوجھل اور کٹھن ہو جاتی ہے۔ ایسے میں یا تو وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے اور موت کے راستے پر چل نکلتا ہے یا پھر اس کے اندر کا تخلیقی انسان جسے ناصر کاظمی، شاعر، کہتے ہیں، بیدار ہوتا ہے؛ اس کی بہت کی خفتہ اور نہفتہ صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں، اور وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔

درد کانٹا ہے اس کی چبھن پھول ہے
درد کی خامشی کا سخن پھول ہے!

(دیوان)

ناصر کاظمی کے ہاں شاعری کے معنی بہت وسیع تھے۔ اپنے اسی آکری انٹرویو میں کہتے ہیں: مجھے غزل، قطعہ، رباعی، آزاد نظم وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں ہے تمہیں پتہ ہے شاعری صرف مصرعے لکھنے کا نام نہیں۔ شاعری تو ایک نقطہ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا، چیزوں کو دیکھنے کا، ان کو موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے۔" اسی گفتگو کا ایک ٹکڑا ملاخطہ ہو:

ناصر: .... آپ یہ دیکھئے کہ بعض لوگ مختلف شعبوں میں پڑے ہیں اور شاعر ہیں، تخلیقی لوگ ہیں۔ ننھے ننھے مزدور۔ میں نے تو دفتروں میں بعض کلرکوں کو دیکھا ہے اور بعض ریڈیو میں،، بیض ادھر ادھر اور اداروں میں؛ وہ بڑے تخلیق لوگ ہیں؛ وہ بڑے خاموش خادم ہیں۔ اس سے برا کون شاعر کون ہے ..... انجن ڈرائیور سے بڑا جو کتنے ہزار اور کتنے سو مسافروں کو لاہور سے کراچی لے جاتا ہے اور کراچی سے واپس لاتا ہے۔ مجھے یہ آدمی بہت پسند ہے اور ایک کانٹے والا پھاٹک بند کرنے والا؛ یہ بھی شاعر ہیں، میری برادری کے لوگ اپنا اپنا Role ہے آپ کو پتہ ہے اگر وہ پھاٹک کھول دے جب گاڑی آرہی ہو، تو کیا قیامت آئے؟ بس شاعر کا بھی یہی کام ہے کہ کس وقت پھاٹک بند کرنا ہے؛ جب گاڑی گزرتی ہے، اس وقت۔

انتظار: لیکن ایسے شاعر بھی تو تم نے دیکھے ہوں گے کہ جب پھاٹک کو بند رہنا چاہیے، اس وقت کھول دیتے ہیں اور جب کھولنا چاہیے، بند کر دیتے ہیں۔

ناصر: کیونکہ وہ صرف اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر جو ہے وہ ساری انسانیت کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب اوروں کا بھلا ہوگا تو اس کا اپنا بھلا خود بخود ہوگا۔

گویا انسان جو بھی۔ جہاں بھی ہو، تخلیقی ہو سکتا ہے؛ اسے تخلیقی ہونا چاہیے ایسی اس کی معراج ہے لیکن اس معراج کو پانے کے لیے اسے تنہائی کے جوکھم سے گزرنا پڑے گا۔ ناصر کاظمی نے اپنے ایک ریڈیو فیچر؛ شاعر اور تنہائی' (مطبوعہ، خشک چشمے کے کنارے) میں لکھا تھا: "روزِ ازل سے تنہائی شاعر کا مقدر رہی ہے [یہاں مقدر سے مراد مجبوری نہیں بلکہ اس کے قرآنی معانی پر توجہ دینا ہوگی۔ (اللہ نے ہر شے پیدا کی اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مقرر کر دیا) ____ ہر شے کے خواص اور امکانات اس کی تقدیر ہیں۔ اقبال کے ہاں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔] تخلیق کی لگن اسے خلوتوں میں لیے پھرتی ہے اور حقیقت ہے کہ انسانی تہذیب کا سورج تنہائی کے غاروں ہی سے طلوع ہوا۔ اس لیے تنہائی تخلیق زندگی کے لیے ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔ تخلیق انسان زندگی کے لیے تنہائی کے دکھ اٹھاتا ہے اور جب اس بھری دنیا میں وہ اکیلا رہ جاتا ہے تو اپنے معبودِ حقیقی کے حضور یوں فریاد کرتا ہے۔

تیری خدائی سے ہے میری جنوں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو

انسان اپنے چار سو سے باہر نہیں نکل سکتا۔ آزادی انسان کی ازلی آرزو ہے لیکن تنہائی سے عہد نامہ کیے بغیر یہ آزادی ممکن نہیں۔ دنیا کی ہر شے تنہائی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اس عالم کی تمام مخلوقات تنہائی کے پردوں ہی میں نشوونما پاتی ہیں۔ انسان شعور رکھتا ہے، اس لیے وہ تمام مخلوقات کے مقابلے میں سب سے زیادہ حساس ہے۔ شعورِ آگہی کا یہ آشوب اسے آسمان و زمین کی وسعتوں میں حیران و سرگرداں لیے پھرتا ہے۔ شاعر کی تنہائیوں نے اس دنیا کے گوشے گوشے کو ایک حیاتِ تازہ بخشی ہے اور اس کی تنہائی کا یہ سفر ابد تک جاری رہے گا......"

" پہلی بارش کے مرکزی کردار کی زندگی میں بھی ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب اس کے اندر کا شاعر بیدار ہوتا ہے اور اسے ایک نئی دنیا

تخلیق کرنے پر ایک نیا طرزِ زیست دریافت کرنے اور اپنانے پر مجبور کرتا ہے ______ پچھلی رات کی تیز ہوا میں / کورا کاغذ بول رہا تھا۔" وہ جب تک غیر تخلیقی زندگی بسر کرتا رہا، کمزور، خوف زدہ اور محتاج رہا؛ تنہائی اس کے لیے دوزخ تھی جس میں وہ " لکڑی کی طرح جلتا تھا" لیکن جب اسے شعور ملا، اس کا احساس جاگا، اس کے اندر تخلیقی سوتے پھوٹے؛ وہ قومی جرأت منداور خدمختار ہو گیا؛ اس نے اپنی جنت کو پالیا، لیکن کہیں باہر نہیں بلکہ:

وہ جنت مرے دل میں چھپی تھی
میں جسے باہر ڈھونڈ رہا تھا
تنہائی مرے دل کی جنت !
میں تنہا ہوں میں تنہا تھا

باصر سلطان کاظمی

اگست ۱۹۸۳ء

پہلی بارش

شفیقہ بیگم کے نام

☆☆☆

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لِکھا تھا

☆

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لِکھا تھا

میں وہ صبرِ صمیم ہوں جس نے
بار امانت سر پہ لیا تھا

میں وہ اسمِ عظیم ہُوں جس کو
جِنّ و مَلک نے سجدہ کیا تھا

تُونے کیوں مِرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا

جو پایا ہے وہ تیرا ہے
جو کھویا وہ بھی تیرا تھا

تُجھ بِن ساری عُمر گزاری
لوگ کہیں گے تُو میرا تھا

پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

☆☆☆

تُو جب میرے گھر آیا تھا
مَیں اِک سپنا دیکھ رہا تھا

☆

تُو جب میرے گھر آیا تھا
میں اِک سپنا دیکھ رہا تھا

تیرے بالوں کی خوشبوں سے
سارا آنگن مہک رہا تھا

چاند کی دھیمی دھیمی ضَو میں
سانولا مکھڑا لَو دیتا تھا

تیری نیند بھی اُڑی اُڑی تھی
میں بھی کچھ کچھ جاگ رہا تھا

میرے ہاتھ بھی سُلگ رہے تھے
تیرا ماتھا بھی جلتا تھا

دو رُوحوں کا پیاسا بادل
گرج گرج کر برس رہا تھا

دو یادوں کا چڑھتا دریا
ایک ہی ساگر میں گرتا تھا

دل کی کہانی کہتے کہتے
رات کا آنچل بھیگ چلا تھا

رات گئے سویا تھا لیکن
تُجھ سے پہلے جاگ اُٹھا تھا

☆☆☆

میں جب تیرے گھر پہنچا تھا
تُو کہیں باہر گیا ہُوا تھا

☆

میں جب تیرے گھر پہنچا تھا
تُو کہیں باہر گیا ہُوا تھا

تیرے گھر کے دروازے پر
سُورج ننگے پاؤں کھڑا تھا

دیواروں سے آنچ آتی تھی
مٹکوں میں پانی جلتا تھا

تیرے آنگن کے پچھواڑے
سبز درختوں کا رمنا تھا

ایک طرف کچھ کچّے گھر تھے
ایک طرف نالہ چلتا تھا

اِک بُھولے ہوئے دیس کا سپنا
آنکھوں میں گُھلتا جاتا تھا

آنگن کی دیوار کا سایہ
چادر بن کر پھیل گیا تھا

تیری آہٹ سُنتے ہی میں
کچّی نیند سے چونک اُٹھا تھا

کِتنی پیار بھری نرمی سے
تُو نے دروازہ کھولا تھا

میں اور تُو جب گھر سے چلے تھے
موسم کِتنا بدل گیا تھا

لال کھجوروں کی چھتری پر
سبز کبوتر بول رہا تھا

دُور کہیں پیڑ کا جلتا سایہ
ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا

☆☆☆

شام کا شیشہ کانپ رہا تھا
پیڑوں پر سونا بکھرا تھا

☆

شام کا شیشہ کانپ رہا تھا
پیڑوں پر سونا بکھرا تھا

جنگل جنگل، بستی بستی
ریت کا شہر اُڑا جاتا تھا

اپنی بے چینی بھی عجب تھی
تیرا سفر بھی نیا نیا تھا

تیری پلکیں بوجھل سی تھیں
میں بھی تھک کر چُور ہوا تھا

تیرے ہونٹ بھی خشک ہوئے تھے
میں تو خیر بہت پیاسا تھا

کھڑکی کے دھندلے شیشے پر
دو چہروں کا عکس جما تھا

جگمگ کنکریوں کا
دشتِ فلک میں جال بچھا تھا

تیرے شانے پر سر رکھ کر
میں سپنوں میں ڈوب گیا تھا

یُوں گزری وہ رات سفر کی
جیسے خوشبو کا جھونکا تھا

☆☆☆

بدن کا پُھول ابھی جاگا تھا
دُھوپ کا ہاتھ بڑھا آتا تھا

☆

دن کا پُھول ابھی جاگا تھا
دُھوپ کا ہاتھ بڑھا آتا تھا

سُرخ چناروں کے جنگل میں
پتّھر کا اِک شہر بسا تھا

پیلے پتھریلے ہاتھوں میں
نیلی جھیل کا آئینہ تھا

ٹھنڈی دُھوپ کی چھتری تانے
پیڑ کے پیچھے پیڑ کھڑا تھا

دُھوپ کے لال ہرے ہونٹوں نے
تیرے بالوں کو چُوما تھا

تیرے عکس کی حیرانی سے
بہتا چشمہ ٹھہر گیا تھا

تیری خموشی کی شہ پاکر
میں کتنی باتیں کرتا تھا

تیری ہلال سی اُنگلی پکڑے
میں کوسوں پیدل چلتا تھا

آنکھوں میں تری شکل چُھپائے
میں سب سے چُھپتا پھرتا تھا

بُھولی نہیں اُس رات کی دہشت
چرخ پہ جب تارا ٹوٹا تھا

رات گئے سونے سے پہلے
تُو نے مُجھ سے کچھ پُوچھا تھا

یُوں گزری وہ رات بھی جیسے
سینے میں سپنا دیکھا تھا

☆☆☆

پتّھر کا وہ شہر بھی کیا تھا
شہر کے نیچے شہر بسا تھا

☆

پتّھر کا وہ شہر بھی کیا تھا
شہر کے نیچے شہر بسا تھا

پیڑ بھی پتّھر، پھُول بھی پتّھر
پتّا پتّا پتّھر کا تھا

چاند بھی پتّھر جھیل بھی پتّھر
پانی بھی پتّھر لگتا تھا

لوگ بھی سارے پتّھر کے تھے
رنگ بھی اُن کا پتّھر سا تھا

پتّھر کا اک سانپ سنہرا
کالے پتّھر سے لپٹا تھا

پتّھر کی اندھی گلیوں میں
میں تجھے ساتھ لیے پھرتا تھا

گونگی وادی گُونج اُٹھتی تھی
جب کوئی پتّھر گِرتا تھا

☆☆☆

پچھلے پہر کا سنّاٹا تھا
تارا تارا جاگ رہا تھا

☆

پچھلے پہر کا سنّاٹا تھا
تارا تارا جاگ رہا تھا

پتّھر کی دیوار سے لگ کر
آئینہ تجھے دیکھ رہا تھا

بالوں میں تھی رات کی رانی
ماتھے پر دن کا راجا تھا

اک رُخسار پہ زلف گری تھی
اک رُخسار پہ چاند ِکھلا تھا

ٹھوڑی کے جگمگ شیشے میں
ہونٹوں کا سایا پڑتا تھا

چندر کرن سی اُنگلی اُنگلی
ناخن ناخن ہیرا سا تھا

اِک پاؤں میں پُھول سی جُوتی
اِک پاؤں سارا ننگا تھا

تیرے آگے شمع دھری تھی
شمع کے آگے اک سایا تھا

تیرے سائے کی لہروں کو
میرا سایا کاٹ رہا تھا

کالے پتّھر کی سیڑھی پر
نرگس کا اک پھول ِکھلا تھا

☆☆☆

گردنے خیمہ تان لیا تھا
دُھوپ کا شیشہ دُھندلا سا تھا

☆

گردنے خیمہ تان لیا تھا
دُھوپ کا شیشہ دُھندلا سا تھا

نکہت و نُور کو رخصت کرنے
بادل دُور تلک آیا تھا

گئے دِنوں کی خوشبو پاکر
میں دوبارہ جی اُٹھا تھا

سوتی جاگتی گُڑیا بنکر
تیرا عکس مجھے تکتا تھا

وقت کا ٹھاٹھیں مارتا ساگر
ایک ہی پل میں سمٹ گیا تھا

جنگل، دریا، کھیت کے ٹکڑے
یاد نہیں اب آگے کیا تھا

نیل گگن سے ایک پرندہ
پیلی دھرتی پر اُترا تھا

☆☆☆

مُجھ کو اور کہیں جانا تھا
بس یونہی رستا بُھول گیا تھا

☆

مُجھ کو اور کہیں جانا تھا
بس یونہی رستا بُھول گیا تھا

دیکھ کے تیرے دیس کی رچنا
میں نے سفر موقوف کیا تھا

کیسی اندھیری شام تھی اُس دن
بادل بھی گِھر کر چھا یا تھا

رات کی طُوفانی بارش میں
تُو مُجھ سے ملنے آیا تھا

ماتھے پر بُوندوں کے موتی
آنکھوں میں کاجل ہنستا تھا

چاندی کا اک پُھول گلے میں
ہاتھ میں بادل کا ٹکڑا تھا

بھیگے کپڑے کی لہروں میں
کندن سونا دمک رہا تھا

سبز پہاڑی کے دامن میں
اُس دن کتنا ہنگامہ تھا

بارش کی تِرچھی گلیوں میں
کوئی چراغ لیے پھرتا تھا

بھیگی بھیگی خاموشی میں
میں ترے گھر تک ساتھ گیا تھا

ایک طویل سفر کا جھونکا
مُجھ کو دُور لیے جاتا تھا

☆☆☆

تُو جب دو بارہ آیا تھا
میں ترا رستہ دیکھ رہا تھا

☆

تُو جب دو بارہ آیا تھا
میں ترا رستہ دیکھ رہا تھا

پھر وہی گھر، وہی شام کا تارا
پھر وہی رات وہی سپنا تھا

تُجھ کو لمبی تان کے سوتے
میں پہروں تکتا رہتا تھا

ایک انوکھے وہم کا جھونکا
تیری نیند اُڑا دیتا تھا

تیری ایک صدا سُنتے ہی
میں گھبرا کر جاگ اُٹھتا تھا

جب تک تُجھ کو نیند نہ آتی
میں ترے پاس کھڑا رہتا تھا

نئی انوکھی بات سُنا کر
میں تیرا جی بہلاتا تھا

یُوں گزرا وہ ایک مہینہ
جیسے ایک ہی پل گزرا تھا

ایک وہ دن جب بیٹھے بیٹھے
تجھ کو وہم نے گھیر لیا تھا

صبح کی چائے سے پہلے اُسدن
تونے رختِ سفر باندھا تھا

آنکھ کُھلی تو تجھے نہ پا کر
میں کتنا بے چین ہُوا تھا

اب نہ وہ گھر نہ وہ شام کا تارا
اب نہ وہ رات نہ وہ سپنا تھا

آج وہ سیڑھی سانپ بنی تھی
کل جہاں خوشبو کا پھیرا تھا

مُرجھائے پُھولوں کا گجرا
خالی کھونٹی پر لٹکا تھا

پچھلی رات کی تیز ہوا میں
کورا کاغذ بول رہا تھا

☆☆☆

تُجھ بِن گھر کِتنا سُونا تھا
دیواروں سے ڈر لگتا تھا

☆

تُجھ بِن گھر کِتنا سُونا تھا
دیواروں سے ڈر لگتا تھا

بُھولی نہیں وہ شامِ جُدائی
میں اُس روز بہت رویا تھا

تجھ کو جانے کی جلدی تھی
اور میں تُجھ کو روک رہا تھا

میری آنکھیں بھی روتی تھیں
شام کا تارا بھی روتا تھا

گلیاں شام سے بُجھی بُجھی تھیں
چاند بھی جلدی ڈوب گیا تھا

سنّاٹے میں جیسے کوئی
دُور سے آوازیں دیتا تھا

یادوں کی سیڑھی سے ناصرؔ
رات اک سایا سا اُترا تھا

☆☆☆

دُھوپ تھی اور بادل چھایا تھا
دیر کے بعد تجھے دیکھا تھا

☆

دُھوپ تھی اور بادل چھایا تھا
دیر کے بعد تجھے دیکھا تھا

مَیں اِس جانب تُو اُس جانب
بیچ میں پتّھر کا دریا تھا

ایک پیڑ کے ہاتھ تھے خالی
اک ٹہنی پر دِیا جلا تھا

دیکھ کے دو چلتے سایوں کو
میں تو اچانک سہم گیا تھا

ایک کے دونوں پاؤں تھے غائب
ایک کا پُورا ہاتھ کٹا تھا

ایک کے اُلٹے پیر تھے لیکن
وہ تیزی سے بھاگ رہا تھا

اُن سے اُلجھ کر بھی کیا لیتا
تین تھے وہ اور میں تنہا تھا

☆☆☆

دَم ہونٹوں پر آکے رُکا تھا
یہ کیسا شُعلہ بھڑکا تھا

☆

دَم ہونٹوں پر آکے رُکا تھا
یہ کیسا شُعلہ بھڑکا تھا

تنہائی کے آتشداں میں
میں لکڑی کی طرح جلتا تھا

زرد گھروں کی دیواروں کو
کالے سانپوں نے گھیرا تھا

آگ کی محل سرا کے اندر
سونے کا بازار کُھلا تھا

محل میں ہیروں کا بنجارا
آگ کی کُرسی پر بیٹھا تھا

اک جادو گرنی وہاں دیکھی
اُس کی شکل سے ڈر لگتا تھا

کالے مُنّہ پر پیلا ٹیکا
انگارے کی طرح جلتا تھا

ایک رسیلے جُرم کا چہرہ
آگ کے سپنے سے نکلا تھا

پیاسی لال لہُو سی آنکھیں
رنگ لبوں کا زرد ہُوا تھا

بازو کھینچ کر تیرے بنے تھے
جسم کماں کی طرح ہلتا تھا

ہڈّی ہڈّی صاف عیاں تھی
پیٹ کمر سے آن مِلا تھا

وہم کی مکڑی نے چہرے پر
مایُوسی کا جال بُنا تھا

جلتی سانسوں کی گرمی سے
شیشۂ تن پگھلا جاتا تھا

جسم کی پگڈنڈی سے آگے
جُرم و سزا کا دوراہا تھا

☆☆☆

چاند ابھی تھک کر سویا تھا
تاروں کا جنگل جلتا تھا

☆

چاند ابھی تھک کر سویا تھا
تاروں کا جنگل جلتا تھا

پیاسی کُونجوں کے جنگل میں
میں پانی پینے اُترا تھا

ہاتھ ابھی تک کانپ رہے ہیں
وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا

آنکھیں اب تک جھانک رہی ہیں
وہ پانی کِتنا گہرا تھا

جِسم ابھی تک ٹوٹ رہا ہے
وہ پانی تھا یا لوہا تھا

گہری گہری تیز آنکھوں سے
وہی پانی مجھے دیکھ رہا تھا

کِتنا چُپ چُپ ، کِتنا گُم سُم
وہ پانی باتیں کرتا تھا

☆☆☆

نئے دیس کا رنگ نیا تھا
دھرتی سے آکاش مِلا تھا

☆

نئے دیس کا رنگ نیا تھا
دھرتی سے آکاش مِلا تھا

دُور کے دریاؤں کا سونا
ہرے سمندر میں گِرتا تھا

چلتی ندیاں ، گارے نوکے
نوکوں میں اِک شہر بسا تھا

نوکے ہی میں رَین بسیرا
نوکے ہی میں دن کٹتا تھا

نوکا ہی بچوں کا جُھولا
نوکا ہی پیری کا عصا تھا

مچھلی جال میں تڑپ رہی تھی
نوکا لہروں میں اُلجھا تھا

ہنستا پانی، روتا پانی
مُجھ کو آوازیں دیتا تھا

تیرے دھیان کی کشتی لے کر
میں نے دریا پار کِیا تھا

☆☆☆

چھوٹی رات، سفر لمبا تھا
میں اک بستی میں اُترا تھا

☆

چھوٹی رات، سفر لمبا تھا
میں اک بستی میں اُترا تھا

سُرمانسی کے گھاٹ پہ اُس دن
جاڑے کا پہلا میلا تھا

بارہ سکھیوں کا اک جُھرمت
سیج پہ چکّر کاٹ رہا تھا

نئی نکور کنواری کلیاں
کورا بدن کورا چولا تھا

دیکھ کے جوبن کی پُھلواری
چاند گگن پر شرماتا تھا

پیٹ کی ہری بھری کیاری میں
سُرخ مُکھی کا پھول کِھلا تھا

ماتھے پر سونے کا جھومر
چنگاری کی طرح اُڑتا تھا

بالی رادھا، بالا موہن
ایسا ناچ کہاں دیکھا تھا

کچھ یادیں، کچھ خوشبو لے کر
میں اُس بستی سے نکلا تھا

☆☆☆

تھوڑی دیر کو جی بہلا تھا
پھر تری یاد نے گھیر لیا تھا

☆

تھوڑی دیر کو جی بہلا تھا
پھر تری یاد نے گھیر لیا تھا

یاد آئی وہ پہلی بارش
جب تجھے ایک نظر دیکھا تھا

ہرے گلاس میں چاند کے ٹکڑے
لال صراحی میں سونا تھا

چاند کے دل میں جلتا سُورج
پھول کے سینے میں کانٹا تھا

کاغذ کے دل میں چنگاری
خس کی زباں پر انگارہ تھا

دل کی صورت کا اک پتّا
تیری ہتھیلی پر رکھا تھا

شام تو جیسے خواب میں گزری
آدھی رات نشہ ٹُوٹا تھا

شہر سے دُور ہرے جنگل میں
بارش نے ہمیں گھیر لیا تھا

صبح ہوئی تو سب سے پہلے
میں نے تیرا مُنہ دیکھا تھا

دیر کے بعد مرے آنگن میں
سُرخ انار کا پھُول کِھلا تھا

دیر کے مُرجھائے پیڑوں کو
خوشبو نے آباد کِیا تھا

شام کی گہری اُونچائی سے
ہم نے دریا کو دیکھا تھا

یاد آئیں کچھ ایسی باتیں
میں جنہیں کب کا بُھول چکا تھا

☆☆☆

میں ترے شہر سے پھر گزرا تھا
پچھلے سفر کا دھیان آیا تھا

☆

میں ترے شہر سے پھر گزرا تھا
پچھلے سفر کا دھیان آیا تھا

کتنی تیز اُداس ہوا تھی
دل کا چراغ بُجھا جاتا تھا

تیرے شہر کا اسٹیشن بھی
میرے دل کی طرح سُونا تھا

میری پیاسی تنہائی پر
آنکھوں کا دریا ہنستا تھا

ریل چلی تو ایک مُسافر
مرے سامنے آبیٹھا تھا

سچ مُچ تیرے جیسی آنکھیں
ویسا ہی ہنستا چہرہ تھا

چاندی کا وہی پُھول گلے میں
ماتھے پر وہی چاند کِھلا تھا

جانے کون تھی اُس کی منزل
جانے کیوں تہنا تنہا تھا

کیسے کہوں رُوداد سفر کی
آگے موڑ جُدائی کا تھا

☆☆☆

میں اِس شہر میں کیوں آیا تھا
میرا کون یہاں رہتا تھا

☆

میں اِس شہر میں کیوں آیا تھا
میرا کون یہاں رہتا تھا

گونگے ٹیلو! کچھ تو بولو
کون اِس نگری کا راجا تھا

کِن لوگوں کے ہیں یہ ڈھانچے
کِن ماؤں نے اِن کو جنا تھا

کِس دیوی کی ہے یہ مورت
کون یہاں پُوجا کرتا تھا

کِس دُنیا کی گوِتا ہے یہ
کِن ہاتھو نے اِسے لکھا تھا

کس گوری کے ہیں یہ کنگن
یہ کنٹھا کس نے پہنا تھا

کِن وقتوں کے ہیں یہ کھلونے
کون یہاں کھیلا کرتا تھا

بول مری مٹّی کی چڑیا
تُونے مجھ کو یاد کیا تھا

☆☆☆

پل پل کانٹا سا چُبھتا تھا
یہ مِلنا بھی کیا مِلنا تھا

☆

پل پل کانٹا سا چُبھتا تھا
یہ مِلنا بھی کیا مِلنا تھا

یہ کانٹے اور تیرا دامن
میں اپنا دُکھ بُھول گیا تھا

کتنی باتیں کی تھیں لیکن
ایک بات سے جی ڈرتا تھا

تیرے ہاتھ کی چاہے تو پی تھی
دل کا رنج تو دل میں رہا تھا

کسی پُرانے وہم نے شاید
تجھ کو پھر بے چین کِیا تھا

میں بھی مسافر تجھ کو بھی جلدی
گاڑی کا بھی وقت ہُوا تھا

اِک اُجڑے سے اسٹیشن پر
تُو نے مُجھ کو چھوڑ دیا تھا

☆☆☆

روتے روتے کون ہنسا تھا
بارش میں سُورج نکلا تھا

☆

روتے روتے کون ہنسا تھا
بارش میں سُورج نکلا تھا

چلتے ہوئے آندھی آئی تھی
رستے میں بادل برسا تھا

ہم جب قصبے میں اُترے تھے
سُورج کب کا ڈوب چکا تھا

کبھی کبھی بجلی ہنستی تھی
کہیں کہیں چھینٹا پڑتا تھا

تیرے ساتھ ترے ہمراہی
میرے ساتھ مرا رستہ تھا

رنج تو ہے لیکن یہ خوشی ہے
اب کے سفر ترے ساتھ کِیا تھا

☆☆☆

پون ہری، جنگل بھی ہرا تھا
ہو جنگل کتنا گہرا تھا

☆

پون ہری، جنگل بھی ہرا تھا
ہو جنگل کتنا گہرا تھا

بوٹا بوٹا نُور کا زینہ
سایا سایا راہ نما تھا

کونپل کونپل نُور کی پُتلی
ریشہ ریشہ رس کا بھرا تھا

خوشوں کے اندر خوشے تھے
پُھول کے اندر پُھول کِھلا تھا

شاخیں تھیں یا محرابیں تھیں
پتّا پتّا دستِ دُعا تھا

گاتے پُھول، بُلاتی شاخیں
پھل میٹھے، جل بھی میٹھا تھا

جنّت تو دیکھی نہیں لیکن
جنّت کا نقشہ دیکھا تھا

☆☆☆

تنہائی کا دُکھ گہرا تھا
میں دریا دریا روتا تھا

☆

تنہائی کا دُکھ گہرا تھا
میں دریا دریا روتا تھا

ایک ہی لہر نہ سنبھلی ورنہ
میں طوفانوں سے کھیلا تھا

تنہائی کا تنہا سایا
دیر سے میرے ساتھ لگا تھا

چھوڑ گئے جب سارے ساتھی
تنہائی نے ساتھ دیا تھا

سُوکھ گئی جب سُکھ کی ڈالی
تنہائی کا پُھول کِھلا تھا

تنہائی میں یادِ خُدا تھی
تنہائی میں خوفِ خُدا تھا

تنہائی محرابِ عبادت
تنہائی منبر کا دِیا تھا

تنہائی مرا پائے شکستہ
تنہائی مرا دستِ دُعا تھا

وہ جنّت مرے دل میں چُھپی تھی
میں جِسے باہر ڈھونڈ رہا تھا

تنہائی مرے دِل کی جنّت
میں تنہا ہوں، میں تنہا تھا

☆☆☆

تیرا قصور نہیں، میرا تھا
میں تُجھ کو اپنا سمجھا تھا

☆

تیرا قصور نہیں، میرا تھا
میں تُجھ کو اپنا سمجھا تھا

دیکھ کے تیرے بدلے تیور
میں تو اُسی دن رو بیٹھا تھا

اب میں سمجھا ، اب یاد آیا
تُو اُس دن کیوں چُپ چُپ سا تھا

تجھ کو جانا ہی تھا لیکن
مِلے بغیر ہی کیا جانا تھا

اب تجھے کیا کیا یاد دِلاؤں
اب تو وہ سب کچھ ہی دھوکا تھا

وہی ہوئی ہے جو ہونی تھی
وہی مِلا ہے جو لِکّھا تھا

دِل کو یونہی سا رنج ہے ورنہ
تیرا میرا ساتھ ہی کیا تھا

کِس کِس بات کو روؤں ناصؔر
اپنا کہنا ہی اِتنا تھا

☆☆☆